تعارف

میرزا غالب کے اردو مکاتیب کا جو مجموعہ آپ کے ملاحظہ میں پیش ہو رہا ہے اس کی خصوصیات کے بارے میں چند گزارشیں ضروری ہیں۔

۱۔ اس مجموعے میں میرزا غالب کے وہ تمام خطوط آ گئے ہیں۔ جن کا سراغ مرتب کو مل سکا۔ صرف دو مجموعوں کو چھوڑا گیا ہے۔ ایک مکاتیب رام پور کا مجموعہ دوسرا منشہ نبی بخش حقیر کے نام کا وہ مجموعہ جو ''نادرات غالب کے نام سے چھپا ہے۔

۲۔ تمام خطوط تاریخ اور وار مرتب کر دیے گئے ہیں جن خطوط پر تاریخیں ثبت نہیں تھیں۔ ان کے بارے میں داخلی شہادتوں کی بنا پر قیاسا فیصلہ کیا گیا کہ وہ کس زمانے کے ہوں گے۔ غلب ہے اکثر قیاس درست ہوں۔ اگر کہیں لغزش ہوئی ہو تو اسے مرتب کی سعی نارسا کا نتیجہ سمجھنا چاہیے۔

۳۔ تمام مکتوب الیم کے حالات لکھ دیے گئے ہیں تاکہ میرزا غالب کے ساتھ ان کے تعلق کی حیثیت واضح ہو جائے اور خطوط ملاحظہ فرماتے وقت وہ حیثیت سامنے رہے۔

۴۔ خطوط میں جا بجا مقامی اور تاریخی تلمیحات ہیں۔ جس کی حقیقت مکتوب الیہم سے مخفی نہ تھی، لیکن عام خواندگان کرام تشریح کے بغیر انہیں سمجھ نہیں سکتے اور خطوط سے بقدر طلب و ذوق لذت اندوز نہیں ہو سکتے۔ مرتب نے حتی الامکان تمام تلمیحات کی تشریح کر دی ہے۔

۵۔ ابتداء میں مقدمہ لکھا ہے جس میں انشائے غالب کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ان خصوصیات کو مدنظر رکھتے ہوئے خطوط کا مطالعہ یقیناً زیادہ دلچسپی کا باعث ہوگا۔

میری رائے برسوں سے ہے کہ میرزا غالب کے اردو مکاتیب کو مختلف درجوں میں درسی کتابوں کے طور پر پڑھانے سے اردو زبان کا صحیح ذوق جس پیانے پر پیدا کیا جا سکتا ہے وہ کسی دوسری کتاب سے پیدا نہیں ہو سکتا۔اردوئے معلی اور ''عود ہندی'' فرقوں سے نصاب میں داخل ہیں۔ چونکہ ان مجموعوں کی ترتیب میں وہ اہتمامات نہ کیے جا سکے جو ان کی افادی حیثیت کو واضح کر سکتے۔اس لیے نہ اساتذہ ان کی تدریس پر پوری توجہ کر سکے اور نہ طلبہ ان سے بقدر آرزو فائدہ اٹھا سکے میں نے پیش نظر مجموعے میں اپنی بساط کے مطابق یہ کمی پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس ضمن میں مزید کام ضروری ہے۔ دعا ہے کہ اس کے سرانجام کی بھی توفیق فرامائے۔

مقدمہ

میرزا غالب

میرزا اسد اللہ بیگ خاں قوم سلجوقی ترک، ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کو آگرہ میں پید اہوئے ۔ ان کے دادا میرزا قوقان بیگ خاں اس زمانے میں سمرقند سے ہندوستان آئے تھے ۔ جب سلطنت مغلیہ کے اقبال کا دیا ٹمٹما رہا تھا اور نواب الملک عرف میر منو پنجاب کے ناظم تھے ۔ میرزا قوقان بیگ خاں پہلے میر منو کے پاس ملازم ہوئے ۔ ان کی وفات پر نظامت پنجاب کا کارخانہ درہم برہم نظر آیا تو دہلی چلے گئے ۔ یقینی طور پر معلوم نہیں کہ دہلی میں ہی رہے یا اور کسی جگہ بھی مشغولیت اختیار کی ۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ جب شاہ عالم ثانی مرہٹوں کا سہارا لیکر پورب سے دہلی پہنچا اور ذوالفقار الدولہ نجف خاں کے ہاتھ میں اختیارات کی باگ آئی تو میرزا قوقان بیگ خاں کو بلند شہر کے ضلعے میں پہاسو کا تعلوہ ذات اور رسالے کی تنخواہ کے لیے مل گیا ۔ غالبا دہلی ہی میں انھوں نے شادی کی چار بیٹے اور تین بیٹیاں ہوئیں ۔ ہمیں ان کی نرینہ اولاد میں سے صرف دو کے نام معلوم ہیں : ایک میرزا عبداللہ بیگ خاں عرف میرزا دولہا، دوسرا میرزا نصیر اللہ بیگ خاں ۔

نجف خاں کی وفات کے بعد اس خاندان نے شاہی ملازمت چھوڑ کر ریاست جے پور میں ملازمت کر لی اور بظاہر اسی دور میں اقامت کیلیے آگرہ مناسب سمجھا گیا ۔ عبداللہ بیگ خاں کی شادی آگرہ کے رئیس خواجہ غلام حسین خاں کمیدان کی

صاحبزادی عزت النساء بیگم سے ہوئی اور وہ خانہ داماد کی حیثیت میں وہاں رہنے لگے ۔ ان کے تین بچے ہوئے چھوٹی خانم، میرزا اسداللہ بیگ غالب اور میرزا یوسف خاں۔

عبداللہ بیگ خاں پہلے آصف الدولہ کے پاس لکھنو میں ملازم رہے۔ پھر حیدر آباد چلے گئے ۔ جہاں نظام الملک میر نظام علی خاں آصف جاہ ثانی نے انہیں سو سوار کا افسر مقرر کر دیا۔ یہ نوکری چھٹی تو آگرہ چلے آئے۔ پھر سواروں کا ایک دستہ لیکر ملازمت کی غرض سے الور پہنچے ۔ وہاں ایک لڑائی میں مارے گئے ۔ یہ ۱۸۰۳ء کا واقعہ ہے کہ راج گڑھ میں ان کی قبر بنی میرزا غالب نے مہاراجہ کے قصیدے میں لکھا ہے:

کافی بود مشاہدہ ، شاہ د ضرور نیست

درخاک راج گڑھ پدرم را بود مزار

عبداللہ بیگ خاں کی وفات کے وقت غالب کی عمر صرف پانچ برس کی تھی ۔ چھوٹی خانم ان سے بڑی تھیں ۔ میرزا یوسف دو برس چھوٹے تھے ۔ ان یتیم بچوں کو ان کے حقیقی چچا میرزا نصر اللہ بیگ نے اپنے دامن شفقت میں لے لیا ۔ وہ پہلے مرہٹوں کی طرف سے آگرہ کے صوبہ دار تھے ۔ جب انگریز دہلی اور آگرہ پر قابض ہو گئے اور صوبیدار کی کمشنری بن گئی تو لارڈ لیک نے میرزا نصر اللہ خاں کو چار سو سواروں کا افسر بنا دیا اور ایک ہزار سات سو روپے ماہانہ تنخواہ مقرر کی ۔ پھر میرزا سونک اور سونسا کے پرگنے ہلکر سے بزور چھین لیے ۔ سونک اور سونسا آج کل ضلع متھرا میں ہیں ۔ لارڈ لیک نے اس کارنامے پر خوش ہو کر دونوں پرگنے نصر اللہ خاں

کو دے دیے۔غرض ان کی آمدنی لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپے سالانہ ہوگئی لیکن اس واقعے پر تھوڑی ہی مدت گزری تھی کہ میرزا نصراللہ خاں بھی ۱۸۰۶ء میں اچانک وفات پا گئے۔اس طرح نہ محض ان کی تنخواہ بند ہوئی بلکہ سرکار انگلشیہ نے سونک اور سونسا کے پرگنے بھی اپنے قبضے میں لے لیے۔لیکن میرزا کے پسماندہ کے لیے دس ہزار روپے سالانہ کی پنشن مقرر کردی۔پسماندوں میں مرحوم کی والدہ تین بہنیں ایک بھتیجی تھے۔

پنشن میں قطع و برید

میرزا نصراللہ بیگ خاں کی شادی نواب احمد بخش خاں والی فیروزپور جھرکا کی ہمشیر سے ہوئی تھی اور ان کے پسماندوں کی پنشن فیروزپور جھرکا ہی کی ریاست سے متعلق کردی گئی تھے۔نواب نے پہلے دس ہزار روپے کی رقم گھٹا کر پانچ ہزار کی، پھر اس پانچ ہزار میں سے دو ہزار کا حصہ دار خواجہ حاجی کو بنادیا۔جو میرزا نصراللہ بیگ خاں کے رسالے کا ایک افسر تھا اور میری معلومات کے مطابق اسے میرزا کے خاندان سے کوئی نسبتی علاقہ نہ تھا۔اس لیے پسماندوں میں شمار نہیں ہوسکتا تھا۔گویا میرزا کے متعلقین کے لیے صرف تین ہزار روپے سالانہ کی رقم رہ گئی جو بصورت ذیل تقسیم ہوئی۔

والدہ ہمشیرگان میرزاے مرحوم	پندرہ سو روپے
برادرزادگان میرزاے مرحوم	
(میرزا غالب اور میرزا یوسف)	پندرہ سو روپے

غرض میرزا غالب کو محض ساڑے سات روپے سالانہ یا ساڑھے باسٹھ روپے ماہانہ ملتے تھے۔ ابتداء میں غالب یا ان کے عزیزوں میں سے کسی نے اس قطع و برید کے خلاف اعتراض نہ کیا۔ اس کی کئی وجہیں ذہن میں آتی ہیں مثلاً گھر میں کوئی بالغ مرد نہ تھا جو اصل مطالبے کا تعاقب کرتا۔ نواب احمد بخش خاں کے ساتھ قریبی رشتہ تھا۔ اس لیے ان کے خلاف مقدمہ کھڑا کرنا غیر مناسب سمجھا گیا۔ نواب موصوف مقررہ پنشن کے علاوہ بھی ان لوگوں کو کچھ رقمیں دیتے رہتے تھے۔ اس لیے قانونی کاروائی خلاف تقاضا ے احسان نظر آئی۔ ۱۸۲۶ میں خواجہ حاجی نے وفات پائی جسے نواب بخش خاں نے پنشن میں دو ہزار کا حصہ دار بنالیا تھا اور یوں قانونی کاروائی کا بہت اچھا موقع پیدا ہوگیا۔ سب سے آخر میں یہ کہ پہلی رشتہ داری کی بناء پر خود میرزا کی شادی نواب احمد بخش خاں کی بھتیجی سے ہوگئی۔ اس طرح وہ احمد بخش خاں کے ہم خاندان بن گئے تھے۔

جب میرزا آگرہ چھوڑ کر دہلی میں مقیم ہوگئے تو ان کا امیرانہ ٹھاٹھ بدستور قائم رہا، لیکن آمدنی کے وسائل گھٹنے لگے، یہاں تک کہ وہ قرضدار ہوگئے۔ نیز احمد بخش خاں نے اپنی جائیدار کو بیٹوں میں تقسیم کرکے کاروبار ریاست سے علیحدگی اختیار کر لی، اس وقت میرزا غالب کو خاندانی پنشن کے سلسلے میں چارہ جوئی کا خیال آیا۔ میرا خیال ہے کہ اس کے لیے ان کی بیوی اور بعض دوسرے متعلقین محرک ہوئے جنہیں نواب احمد بخش خاں کے فرزند اکبر شمس الدین احمد خاں سے اختلاف تھا۔ شمس الدین احمد خاں ایک فریق تھا۔ باقی سارا خاندان مخالف فریق تھا۔ اس میں غالب کو بھی شامل ہونا پڑا۔ اسی پنشن کے سلسلے میں غالب نے ۱۸۲۷ء میں کلکتہ کا سفر

اختیار کیا جو اس زمانے میں حکومت انگلشیہ کا مرکز تھا۔ ان کا مطالبہ یہ تھا:

۱۔ دس ہزار روپے کی جو رقم ابتداء میں مقرر ہوئی تھی۔ اسے بحال کیا جائے۔

۲۔ خواجہ حاجی کو میرزا نصر اللہ بیگ کے پسماندوں میں شامل کر کے دو ہزار روپیہ سالانہ دینے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ یہ رقم نیز پانچ ہزار سالانہ کی گھٹائی ہوئی رقم، ۱۸۰۶ء سے یک مشت ادا کی جائے۔

۳۔ آئندہ کے لیے پنشن فیروز پور جھرکا ریاست کے بجائے سرکار انگلشیہ کے خزانے سے متعلق کر دی جائے۔

دعوے ریاست فیروز جھرکا کے خلاف تھا جس کے والی نواب احمد بخش خاں کے فرزند اکبر نواب شمس الدین احمد خاں بن گئے تھے۔ ان کی طرف سے یہ جواب دعویٰ پیش ہوا کہ دس ہزار روپے کی پنشن میں نصف کی تخفیف اور بقیہ رقم میں خواجہ حاجی کا شمول لارڈ لیک کے حکم سے ہوا۔ جو ابتدائی پنشن مقرر کرنے کا ذمہ دار تھا۔ مقدمہ خاصی دیر تک جاری رہا۔ میرزا غالب لارڈ لیک کے دوسرے حکم سے بالکل بے خبر تھے اور کہتے تھے کہ اگر یہ حکم جاری بھی ہوا تو خلاف قاعدہ تھا اور اس کا کوئی ریکارڈ دفتر میں موجود نہیں، نہ کسی بڑے یا چھوٹے حاکم کا کوئی ذاتی حکم سرکار کے منظورہ حکم کا ناسخ ہوتا ہے۔ آخر حکومت نے یہ فیصلہ کیا کہ لارڈ لیک کا دوسرا حکم سر جان میلکم کے پاس بھیج کر پوچھا جائے کہ آیا اس پر مہر اور دستخط لارڈ موصوف ہی کے ہیں؟ سر جان میلکم پنشن کے تقرر کے زمانے میں لارڈ لیک کا سکرٹری تھا اس نے مہر دستخط کی تصدیق کر دی تو یہ حکم صحیح تسلیم کر لیا گیا اور میرزا غالب کا دعوے خارج ہو گیا اس طرح انھیں ساڑھے سات سو روپے سالانہ پر قناعت کرنی پڑی۔

شادی اور دہلی میں توطن

میرزا غالب کی شادی تیرہ برس کی عمر میں نواب احمد بخش خاں کے بھائی نواب الٰہی بخش خاں معروف کی بڑی صاحبزادی امراؤ بیگم سے ہوئی ۔ اس تعلق کی بنا پر وہ پندرہ سولہ برس کی عمر میں آگرہ کی سکونت چھوڑ کر دہلی مقیم ہو گئے ۔ اور باقی زندگی اس شہر میں گزاری ۔ ان کے بھائی میرزا یوسف بھی آگرہ سے دہلی آ گئے تھے ۔ وہ دیوانے ہو گئے تھے ۔ ۱۸۵۷ء کو ہنگامے میں بحالت دیوانگی فوت ہوئے ۔ بیگم کی وجہ سے نواب احمد بخش خاں کا خاندان میرزا کا اپنا خاندان بن چکا تھا اس کے مختلف افراد کی اجمالی کیفیت یہ ہے ۔

۱۔ نواب غلام حسین خاں مسرور

جو میرزا کے ہم زلف یعنی بیگم امراؤ کی چھوٹی بہن آبادی بیگم کے شوہر تھے ۔

۲۔ میرزا زین العابدین خاں عارف ابن غلام حسین خاں مسرور

جنہیں امراؤ بیگم نے اپنا بیٹا بنا لیا تھا وہ ۱۸۵۲ھ میں بہ عالم جوانی فوت ہو گئے ۔

۳۔ باقر علی خاں کامل اور حسین علی خاں شاداں فرزندان زین العابدین خاں عارف حسین علی خاں شاداں

کو بیگم غالب بچپن ہی میں اپنے پاس لے آئی تھی۔ عارف کی وفات کے بعد باقر علی خاں بھی میرزا کے پاس آ گئے۔ یہ میرزا کی زندگی میں الور میں ملازم ہو گئے تھے۔ میرزا کی وفات کے بعد ملازمت چھوڑ کر گھوڑوں کی تجارت شروع کر دی اور جوانی میں فوت ہو گئے۔ میرزا کی وفات کے بعد حسین علی خاں رام پور میں پچیس روپے کے ملازم ہو گئے تھے اپنے بڑے بھائی کی وفات کے بعد یہ بھی چل بسے۔

۴۔علی بخش خاں ابن الٰہی بخش خاں معروف

یعنی بیگم غالب کے حقیقی بھائی۔ ابتداء میں انھیں فیروز پور جھرکا سے سو روپے پنشن ملتی تھی۔ جو ریاست کی ضبطی کے بعد نصف رہ گئی۔ غدر کے بعد وہ دہلی سے باہر رہے۔ ۱۸۶۴ء میں فوت ہوئے۔ ان کے بیٹے غلام فخر الدین خاں، بہادر شاہ ثانی کی جاگیر کوٹ قاسم کے منتظم تھے۔ غدر کے بعد ان پر مقدمہ چلا، لیکن بری ہو گئے، ان کیشادی میرزا کے بھائی یوسف خاں کی اکلوتی بیٹی سے ہوئی تھی۔ ان کے بیٹے محمد سعید خاں حدیار آباد چلے گئے تھے۔ کئی برس کی ملازمت کے بعد درویشی اختیار کر لی۔ ان کے بیٹے میرزا نصر اللہ خاں بیرسٹرایٹ لاء دولت آصفیہ میں صدر محاسب بن گئے تھے۔ معروف کے دیوان کی پہلی جلد انھی نے شائع کی تھی۔

۵۔نواب شمس الدین احمد خاں (نواب احمد بخش خاں کے فرزند اکبر)

ریاست فیروزپور جھرکا کے والی بنے دو چھوٹے بھائیوں سے ان کا جھگڑا ہو گیا جنھیں نواب احمد بخش خاں نے لوہارو کی جاگیر دے دی تھی۔ شمس الدین احمد خاں چاہتے تھے کہ لوہارو میں بھی ان کا انتظام ہو اور چھوٹے بھائیوں کو ایک مقررہ رقم ملتی رہے۔ انتظام ریاست سے کوئی سروکار نہ ہو۔ بھائی کہتے تھے کہ لوہارو کے علاوہ والد کی منقولہ جائداد میں سے بھی حصہ ملنا چاہیے۔ یہ جھگڑا دیر تک چلتا رہا۔ آخر ولیم فریزر ریزیڈنٹ دہلی کی کوشش سے لوہارو چھوٹے بھائیوں کو مل گیا۔ اس وجہ سے شمس الدین احمد خاں اور ولیم فریزر کے درمیان دشمنی پیدا ہو گئی جس نے عام شہرت حاصل کر لی۔ ۱۸۳۵ء میں فریزر مارا گیا۔ اس کے قتل کا الزام شمس الدین احمد خاں اور اس کے ایک ملازم پر لگا۔ دونوں کو پھانسی ملی اور ریاست ضبط ہو گئی۔

۶۔ امین الدین احمد خاں (نواب احمد بخش کاں کے منجھلے فرزند)

جنھیں لوہار کارروائی تسلیم کیا گیا۔ یہ ۱۸۶۹ء میں فوت ہوئے۔ نواب علاؤالدین احمد خاں علائی (غالب کے خلیفہ ثانی) انھیں کے فرزند اکبر اور جانشین تھے۔ علائی نے ۱۸۷۴ء میں وفات پائی اور ان کے فرزند اکبر امیر الدین احمد خاں رئیس بنے جن کا دوسرا نام فرخ میرزا تھا اور غالب انھیں فرخ سیر کہا کرتے تھے۔

۷۔ ضیاءالدین احمد خاں نیر (نواب احمد بخش خاں کے فرزند اصغر)

لوہارو سے حصے کی رقم مال کرتی تھی اردو فارسی کے ادیب اور شاعر تھے۔ اردو

میں نیر فارسی میں رخشاں تخلص تھا۔تاریخ کے یگانہ عالم مانے جاتے تھے۔ایلیٹ نے اپنی تاریخ مرتب کرتے وقت زیادہ تر نادر قلمی نسخے انھی سے لیے تھے۔

۸۔شہاب الدین احمد خاں ثاقب (نیر کے فرزند اکبر)

۱۸۶۹ء میں فوت ہوئے۔ان کے چار بیٹے تھے۔۱) شجاع الدین احمد خاں تاباں،جن کی شادی باقر علی خاں کامل کی بڑی صاحبزادی سے ہوئی تھی اور وہ لاولد فوت ہوئے۔(۲) سراج الدین احمد خاں سائل،جن کا انتقال چند سال پیشتر ہوا۔(۳) بہاؤالدین خاں،ان کی صرف ایک صاحبزادی تھی جن کی شادی نواب سر ذوالفقار علی خاں مرحوم رئیس مالیر کوٹلہ سے ہوئی۔یہ صاحبزادی یعنی بیگم ذوالفقار علی خاں بفضل خدا زندہ ہیں (۴) ممتاز الدین احمد خاں کی بھی ایک ہی بیٹی تھی جس کی شادی سر امیر االدین خاں سے ہوئی۔

۹۔سعیدالدین احمد خاں طالب

(نیر کے فرزند اصغر) لاولد فوت ہوئے۔

شغل شعروادب:

میرزا غالب نے معمول کے مطابق عربی اور فارسی کی تعلیم پائی۔گیارہ برس کی عمر میں شعر کہنے لگے۔اردو ان کی مادری زبان تھی۔اس لیے کہ ان کی والدہ

ہندوستانی تھیں ۔فارسی اس عہد کی مروجہ تعلیمی زبان تھی جس طرح بعد میں انگریزی تعلیمی زبان بنی ۔ترکی بھی انکے گھر کی ایک بولی تھی ۔خواجہ حالی نے لکھا ہے کہ ان کے دادا کی زبان ترکی تھی اور ہندوستانی بہت کم سمجھتے تھے ۔والد چچا بھی یقیناً ترکی جانتے ہوں گے اور میرزا بھی اس سے ناواقف نہ ہوں گے ۔وہ تیرہ چودہ برس کے تھے جب ایک نومسلم پارسی بطریق سیاح آگرہ پہنچا اور کم وبیش دو برس میرزا کے ہاں ٹھہرا رہا۔اس کا اصل نام ہرمزد تھا۔مسلمان ہونے کے بعد عبدالصمد نام اختیار کیا ۔یہ فارسی اور عربی کا اجل فاضل اور منطق فلسفہ کا یگانہ ماہر تھا۔خصوصاً قدیم فارسی کے حقائق وغوامض پر اسے پورا پورا عبور حاصل تھا۔اسی عبدالصمد کی تعلیم نے میرزا کے طبعی جوہروں کو جلا دے کر روشن کر دیا ۔مروجہ تعلیم نے کچھ سیکھا عبدالصمد ہی سے سیکھا۔

شاعری کا جوہر انھیں مبداء فیاض سے ملا تھا۔طبیعت مشکل پسند تھی ۔میرزا عبدالقادر بیدل کا کلام پڑھا تو اردو میں بیدل ہی کے رنگ میں شعر کہنے لگے ۔اس دور کا کلام ،نسخہ حمیدیہ کے نام سے چھپ چکا ہے۔اس کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شروع میں بیدل میرزا کے دل ودماغ پر بے طرح مسلط تھا۔انھوں نے مختلف غزلوں کے مقطعوں میں اس کا اظہار بھی کر دیا ہے جیسے جیسے طبیعت میں پختگی آتی گئی ۔طرزفکر ونظر میں تبدیلی یا کہنا چاہیے صفائی اور پختگی آتی گئی ۔پھر وہ فارسی گوئی پر متوجہ ہوئے ۔ یہاں تک کہ دورمتوسط میں اردو کے بجائے فارسی ہی کے شاعر سمجھے جاتے تھے۔

دہلی میں اقامت کے بعد شاعروں کے عام طریقے کے مطابق انہوں نے

شاہی دربار سے بھی تعلق پیدا کرنے کی کوشش کی۔ وہ عرفی اور نظیری کے ہم پایہ تھے۔ لیکن ان کے زمانے کا شاہی دربار مغلوں کی سطوت و شوکت کا محض ایک بے رنگ نقش رہ گیا تھا۔ اس لیے میرزا کا کمال شاعری جس قدر دانی و منزلت شناسی کا حقدار تھا وہ اسے نصیب نہ ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ اکبر شاہ ثانی کی مدح میں وہ ایک قصیدہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔ ۱۸۳۷ء میں ابوظفر سراج الدین تخت نشین ہوا تو اس کی مدح میں قصیدوں پر قصیدے کہنے لگے۔ ان قصیدوں کے محرک غالباً وہ لوگ تھے جو میرزا کے دوست تھے اور دربار میں انھیں خاصا رسوخ حاصل تھا۔ انھیں میں سے شیخ نصیر الدین عرف کالے صاحب (بہادر شاہ کے پیر) اور حکیم احسن اللہ خاں کی سفارش سے ۱۸۵۰ء میں میرزا کو تیموری خاندان کی تاریخ لکھنے کا کام سونپا گیا۔ نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ خطاب ملا اور پچاس روپے مہینا تنخواہ مقرر ہوئی۔ پوری تاریخ کا نام پرتوستان تھا۔ اس کی دو جلدیں تجویز ہوئیں۔ جلد اول میں ابتدائے آفرینش سے ہمایوں بادشاہ تک کا حال جلد دوم میں جلا الدین اکبر سے بہادر شاہ ثانی تک کا حال، پہلی جلد کا نام ''مہر نیمروز'' اور دوسری کا نام، ماہ نیم ماہ قرار پایا۔ میرزا نے پہلی جلد ۱۸۵۲ء میں مکمل کر دی۔ دوسری کو تسوید و ترتیب شروع نہ ہو سکی۔

دربار شاہی سے تعلق کے زمانے میں میرزا نے اپنی اکثر بہترین اردو غزلیں کہیں۔ اس لیے کہ قلعے میں مشاعرے ہوتے تھے جن میں میرزا کو شریک ہونا پڑتا تھا۔ بہادر شاہ ویسے بھی اردو غزلیں طلب کرتے رہتے تھے جیسا کہ خود میرزا نے ۱۸۵۱ء کے ایک خط میں منشی نبی بخش حقیر کو لکھا ہے کہ مغلوں کی حکمرانی کے تمام

مناصب انگریزوں کے قبضے میں چلے گئے تھے۔ میرزا کے پاس شعر گوئی کے سوا کوئی ہنر نہ تھا اس لیے انگریز حاکموں اور ملکہ وکٹوریہ کی مدح میں بھی انھوں نے قصیدے کہے۔ ایک قصیدے میں کس دردوسوز سے کہتے ہیں

باصلیم فتادہ کا ہے دہر
علم کا وہاں نمی خواہم

انھوں نے چند قصیدے متفرق امرا کی مدح بھی کہے۔ مثلاً نصیر الدین حیدر۔ امجد علی شاہ والیان اودھ، نواب یوسف علی خاں اور نواب کلب علی خاں والیان رام پور، سر سالار جنگ وزیر اعظم حیدر آباد، نواب وزیر الدولہ والی ٹونک، راجہ شیو دھان سنگھ مسند نشین الور۔ مہاراجہ نرندر سنگھ والی پٹیالہ۔ چند قصیدے دوستوں کی مدح میں ہیں۔ مثلاً نواب مصطفی خاں شیفتہ، مفتی صدر الدین آزردہ، نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر۔ ان قصیدوں کا مدعا میرزا غالب کی اصطلاح خاص میں محض ''بخشش'' نہ تھا بلکہ قصیدہ گوئی کمالات شاعری کی نمائش کا ایک متداول ذریعہ تھی۔

خاندانی پنشن کے علاوہ میرزا سات برس تک قلعے سے تنخواہ پاتے رہے۔ انھیں مختلف امراء کیطرف سے صلے ملے ہونگے نواب یوسف علی خاں والی رام پور نے مستقل تنخواہ مقرر کر دی تھی جو ان کے جلیل القدر فرزند نواب کلب علی خاں کے عہد حکومت میں بھی جاری رہی۔

قاطع برہان کا ہنگامہ اور وفات

میرزا کو ہندوستان کے عام فارسی شعراء کی طرز و روش پسند نہ تھی نہ انھیں مستند مانتے تھے۔ کلکتہ کے ایک اجتماع میں ان کے کلام پر اعتراض ہوئے اور معترضین نے میرزا قلیل کی سند پیش کی تو میرزا نے سند کو بے پروائی سے ٹھکرا دیا۔ اس پر ہنگامہ بپا ہوا اور میرزا نے معذرت کے طور پر مثنوی باد مخالف لکھی۔ اس میں ایک جگہ فارسی کے مشہور اساتذہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

آنکہ طے کردہ ایں مواقف را
چہ شناسد قتیل و واقف را؟

ایک غزل کے مقطع میں فرماتے ہیں:

غالب سوختہ جاں راچہ بہ گفتار آری
بہ دیارے کہ ندانند نظیری ز قتیل

غدر کے زمانے میں ان کے پاس برہان قاطع مولفہ محمد حسین تبریزی ثم دکنی) کے مطبوعہ نسخے کے سوا کوئی کتاب نہ تھی۔ غدر کے حالات میں دستنبوے لکھنے سے فارغ ہوئے تو برہان قاطع ،کو دیکھنے لگے، اس میں جو غلطیاں آئیں۔ ان پر نشان لگاتے رہے پھر ایک کتاب مرتب کردی جسکا نام رو برہان قاطع کی نسبت سے قاطع برہان رکھا یہ فارسی کے ہندوستانی لغت نگاروں کو کھلا چیلنج تھا۔ قاطع برہان کے ردو اثبات میں کئی کتابیں لکھی گئیں اور میرزا کی زندگی کے آخری دم تک تغلیط و توثیق کا ہنگامہ گرم رہا۔ قاطع برہان کو بعض فوائد کے اضافے کے ساتھ انھوں نے دوبارہ چھپوایا تو اس کا نام درفش کاویانی، رکھا۔

تہتر برس تین مہینے اور ۲۳ دن کی عمر پا کر میرزا ۱۵ فروری ۱۸۶۹ھ کو اس

خاکداں سے رہ گرائے عالم بقا ہوئے۔ بیگم نے پورے ایک برس بعد انتقال کیا۔

میرزا کے سات بچے ہوئے، لیکن کوئی پندرہ مہینے سے زیادہ زندہ نہ رہا۔ صرف میرزا کا کلام بقائے نام اور شہرت عام کی دستاویز رہ گیا۔

تصانیف

میرزا کی تصانیف کا مختصر سا نقشہ یہ ہے:

ا۔ کلیات نظم فارسی::

اس میں قطعات، ترکیب بن، ترجیع بند، مثنویاں، قصیدے، غزلیں اور رباعیاں غرض سب کچھ شامل ہیں۔

۲۔ کلیات نثر فارسی::

اس میں میرزا کی تین کتابیں شامل ہیں (۱) پنج آہنگ، جو فارسی کے قواعد تقریظوں اور فارسی خطوں پر مشتمل ہے۔ (۲) مہر نیمروز یعنی تاریخ خاندان تیموری (۳) دستنبو ے جس میں غدر کے دیدہ و شنیدہ حالات درج ہیں۔ آخری کتاب خالص فارسی ہے اور اس میں عربی کا ایک لفظ بھی نہیں آیا۔

۳۔ دیوان اردو::

اسکے پاس ایڈیشن صرف میرزا کی زندگی میں شائع ہو چکے تھے۔ بعد میں بیسیوں اڈیشن چھپے اور متعدد شرحیں لکھی گئیں۔

۴۔ نسخہ حمیدیہ ::

میرزا کے ابتدائی اردو کلام کا مجموعہ جسے وہ قلم انداز کر چکے تھے۔

۵۔ سبد چیں ::

میرزا کا وہ فارسی کلام جو کلیات نظم فارسی میں شامل نہ ہو سکا یا کلیات کی طباعت کے بعد کہا گیا

۶۔ عود ہندی ::

اردو خطوط کا وہ مجموعہ جو میرزا کی وفات سے چار ماہ پیشتر میرٹھ میں چھپا تھا۔

۸۔ اردوئے معلیٰ حصہ اول ::

اردو خطوط کا وہ مجموعہ جو میرزا کی زندگی میں مرتب ہوا۔ دہلی میں چھپ رہا تھا، لیکن میرزا کی وفات کے بعد طباعت مکمل ہوئی۔

۹۔ اردوئے معلیٰ حصہ دوم ::

جو اردو خطوط پہلے حصے میں شامل نہیں ہوئے تھے۔ ان کا ایک مجموعہ خواجہ حالی نے مرتب کر کے مطبع مجتبائی کے حوالے کر دیا تھا۔ ۱۸۹۹ء میں یہ بھی حصہ اول کے ساتھ شائع ہو گیا۔

۱۰۔ نادر خطوط غالب::

میرزا کے ستائیس اردو مکاتیب کو مجموعہ جو کرامت حسین کرامت ہمدانی بہاری صفیر بلگرامی اور صوفی منیری کو لکھے گئے تھے۔ میرے نزدیک ان کا سب کا مستقل وجود محل نظر ہے۔

۱۱۔ مکاتیب غالب::

میرزا کے ان خطوں کا مجموعہ جو والیان رام پور و لکھے گئے۔

۱۲۔ متفرقات غالب::

میرزا کے فارسی نظم و نثر کے تبرکات۔

۱۳۔ نادرات غالب::

میرزا کے ان خطوط کا مجموعہ جو منشی نبی بخش حقیر کو لکھے گئے تھے۔

۱۴۔انتخاب غالب::

اردو اور فارسی اشعار کا وہ انتخاب جو میرزا نے نواب کلب علی خاں والی رام پور کی فرمائش پر کیا تھا۔ یہ بھی دربار رام پور کی توجہ سے چھپ گیا ہے۔

۱۵۔قاطع برہان::

جسے بعض فوائد کے اضافے کے ساتھ دوبارہ درفش کاویانی، کینام سے چھپایا گیا۔

۱۶۔نامہ غالب::

قاطع برہان کی بحث کے سلسلے کا وہ طویل خط جو میرزا رحیم بیگ مولف ''قاطع برہان کے نام لکھا گیا تھا۔ الگ بھی چھپ گیا تھا۔ اودھ اخبار میں بھی شائع ہوا تھا۔ عود ہندی میں بھی شامل ہو گیا تھا۔

۱۷۔تیغ تیز::

قاطع برہان کی بحث کے سلسلے کا ایک اور رسالہ۔

۱۸۔نکات ورقعات غالب::

اس میں پنج آہنگ سے فارسی قواعد والے حصے کا اردو ترجمہ کرکے پندرہ فارسی خطوط شامل کر دیئے گئے تھے۔

۱۹۔قادر نامہ::

بچوں کے نصاب کی کتاب۔

۲۰۔لطائف غیبی::

قاطع برہان کی بحث کے سلسلے کی ایک کتاب جو سیف الحق میاں داد خاں سیاح کے نام سے چھپی۔

۲۱۔سوالات عبدالکریم::

یہ بھی قاطع برہان کے سلسلے کا ایک رسالہ ہے جو عبدالکریم کے نام سے چھپا، لیکن دراصل میرزا نے لکھا تھا۔

۲۲۔گل رعنا::

میرزا نے اپنے عزیز دوست سراج الدین احمد کی فرمائش پر اردو اور فارسی کلام کا ایک انتخاب مرتب کیا تھا اس کا نام گل رعنا رکھا تھا۔اس کا صرف ایک حصہ موہانی کے پاس تھا جیسا کہ ایک مرتبہ مرحوم نے خود بتایا۔

میرزا کا مقام ادب و شعر میں

ادب و شعر میں میرزا کی رفعت و برتری کسی شرح کی محتاج نہیں رہی۔ جامعیت ان کی نمایاں ترین خصوصیت ہے۔ بے شائبہ مبالغہ ہندوستان نے امیر خسرو کے بعد ان جیسا جامع شخص پیدا نہیں کیا۔ وہ فارسی اور اردو دونوں زبانوں کے یگانہ شاعر تھے۔ حافظ اور نظیری کی طرح محض غزل ہی میں نہیں عرفی کی طرح محض غزل اور قصیدے ہی میں نہیں۔ بلکہ تمام اصناف سخن میں انکی مرتبت عموما مسلم ہے۔ غزل قصیدہ، رباعی۔ مثنوی ترکیب بند، ترجیح بند، قطعہ مرثیہ نوحہ وغیرہ کوئی صنف نظم نہیں، جس میں ان کا پایہ یکساں بلند اور مختلف اصناف کے مشاہیر اساتذہ کے برابر نہ ہو۔ اردو نظم میں اگر چہ انکا کلام تھوڑا ہے لیکن جتنا ہے ہر لحاظ سے ہماری قومی زبان کا نہایت گراں بہا سرمایا ہے۔ پھر میرزا فارسی نثر کے یگانہ ادیب تھے۔ فارسی کلیات نثر میں ہر رنگ اور ہر انداز کی نثریں موجود ہیں۔ ابوالفضل کا سرمایہ، شہرت صرف نثر نگاری تھی۔ میرزا نثر میں اس سے پیچھے نہیں اور نثر نگاری ان کے کمالات فطری کی بہار آفرینی کا محض ایک کرشمہ ہے۔ اردو نثر میں ان کیصرف مکاتیب ہیں یا چند تقریظیں اور دیباچے، لیکن حسن کلام لطف بیان روانی و انسجام، بے ساختگی اور دل آویزی میں نثر کا ایسا جلیل الشان مجموعہ نہیں مل سکتا۔

اگر میرزا کے خداداد جوہروں کا اندازہ اس بنا پر کیا جائے کہ زندگی میں انھیں شعرو ادب کے ذریعہ سے کس قدر مالی منافع حاصل ہوئے یا انھوں نے کون کون سے اعزازات پائے تو لاریب خود ان کی زبان مستعار لے کر کہنا پڑے گا۔

درآں دیار کہ گوہر خریدن آئین نیست
دکاں کشودہ ام و قیمت گہر گویم

یا

بہ کلبہام گہر شب چراغ پوش است
سخن زتیرگی طالع ہنر گویم

لیکن اگر ان کی شہرت و ناموری اور وفات کے بعد روز افزوں قدر و منزلت کو سامنے رکھا جائے تو تسلیم کرنا چاہیے کہ علامہ اقبال مرحوم کو چھوڑ کر اردو زبان کے کسی شاعر کو عقیدت عامہ کی ویسی گراں بہا متاع نصیب نہیں ہوئی جیسی میرزا کے حصے میں آئی۔ انھوں نے خود پیش گوئی کی تھی۔

کو کم راد رعدم اوج قبولے بود است
شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

غالب کی اردو نثر

بلا شبہ ان کے مختصر سے اردو دیوان کی بہت قدر ہوئی جسے وہ بے رنگ اور روزم برگے نخلستان فرہنگ، کہتے تھے لیکن فارسی پر قطعاً توجہ نہ ہوئی جسے وہ نقشہائے رنگ رنگ کا نگارخانہ قرار دے رہے تھے۔ اب فارسیت کا ذوق اتنا کم ہو گیا ہے اور ادبی فکر و نظر کا رخ اس قدر بدل گیا ہے کہ شاید ہی میرزا کی فارسی پر توجہ کی نوبت آئے لیکن کتنے افسوس کا مقام ہے کہ ان کی اردو نثر بھی اب تک ٹھیک ٹھیک مرتب نہ ہو سکی۔ اردوئے معلی اور عود ہندی اگرچہ نصاب میں شامل رہیں، ان کے کئی

ایڈیشن بھی شائع ہوئے لیکن ان رقعات کو تاریخ وار مرتب کرنے کا خیال کسی کو نہ آیا۔

یہاں یہ بحث چھیڑنے کی ضرورت نہیں کہ غالب کے اردو دیوان سے بہ درجہ شغف جو شیفتگی نے **ملک** میں شعر کا صحیح ذوق پیدا کیا یا نہیں اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کے اردو مکاتیب نثر نگاری کا صالح اور صحیح مذاق پیدا کرنیکے لیے بے حد مفید ثابت ہو سکتے تھے۔ ان میں ہر درجے اور ہر رنگ کی تحریریں موجود تھیں ایسی بھی جو بچوں کو بے تکلف پڑھائی جا سکتی تھیں۔ ایسی بھی جو دقیق علمی و ادبی نکات کی حامل تھیں اور صرف اہل علم ہی ان سے محظوظ ہو سکتے تھے پھر ان میں رنگ رنگ کے مطالب بیان ہوتے تھے اور ہر قسم کی تحریروں کے نمونے ملتے تھے تاہم تعجب ہے کہ انھیں صرف رسمی خطوط سمجھ لیا گیا اور اس لحاظ سے نہ دیکھا گیا کہ ان میں صحیح مذاق نگارش کی پرورش کے کتنے جوہر موجود ہیں۔ وہ اگر محفوظ رہے تو زیادہ تر اس لیے کہ ایک باکمال اور شہرہ آفاق شاعر کے تبرکات تھے۔ اس لیے نہیں کہ بجائے خود محفوظ رہنے اور فروغ پانے کے حقدار تھے۔

تین ضروری کام

ان مکاتیب کی ترتیب و تدوین کے سلسلے میں تین کام ضروری تھے۔

ا۔ خطوط کو نگارش کی تاریخوں کے لحاظ سے مرتب کیا جاتا۔ تاکہ مختلف مباحث و مطالب تاریخی ترتیب پا کر زیادہ لطف انگیز اور دل پذیر بن جاتے۔ نیز مکتوب الیہم کے حالات اختصار لکھ دیئے جاتے تاکہ میرزا کے ساتھ ان کا تعلق واضح

ہو جاتا۔

۲۔ مکاتیب میں قدم قدم پر ایسے اشارے موجود تھے جو شرح کے بغیر سمجھ میں نہیں آ سکتے تھے۔ میرزا نے مکتوب الیہ کا علم و نظر پیش رکھتے ہوئے محض اشارے کر دیا کافی سمجھا۔ لیکن ہمارے لیے وہ سراسر یا بیشتر مبہم بن چکے تھے۔ جب تک انھیں کھول کر نہ بیان کیا جاتا۔ مختلف عبارتوں کا پورا مطلب ذہن میں نہیں آ سکتا تھا۔ اور نہ خواندہ ان سے بوجہ اتم لذت اندوز ہو سکتا تھا۔ اس بنا پر حواشی لکھنے ضروری تھے۔

۳۔ میرزا کی خصوصیات نگارش اور لطائف تحریر کو تفصیلاً نہیں تو کم از کم اجمالاً بیان کر دیا تھا۔

مدت ہوئی میں نے یہ کام شروع کر دیا تھا۔ جب معلوم ہوا کہ منشی مہیش پرشاد پروفیسر بنارس یونیورسٹی خطوط غالب مرتب کر رہے ہیں اور انھوں نے ارادہ کر لیا ہے کہ تمام خطوں ک کا مقابلہ حتی الامکان اصل خطوں سے کریں گے میں نے اپنا کام روک دیا۔ اس لیے ک جو وسائل تحقیق و تقابل منشی صاحب کو میسر تھے وہ مجھے میسر نہ تھے اور جب ایک کام بہتر طریق پر انجام پا رہا تھا تو اسے کمتر پیانے پر انجام دینے کے لیے وقت صرف کرنا بالکل غیر مناسب تھا۔ چنانچہ منشی صاحب کے مرتبہ خطوط کی پہلی جلد ہندوستانی اکیڈمی نے شائع کر دی پھر یہ سلسلہ غیر معلوم وجوہ کی بنا پر تعطل میں پڑ گیا۔ گویا اصل کام پایہ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔

منشی مہیش پرشاد کا مجموعہ

منشی مہیش پرشاد صاحب کی کاوش مستحق صد ستایش ہے لیکن ان کا مجموعہ چھپا، وہ بھی غلطیوں سے پاک نہ تھا جیسا کہ پیش نظر مجموعے کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہو جائے گا پھر ان کا مرتبہ مجموعہ مکمل نہ چھپا اور کام ادھورا رہ گیا۔ نیز منشی صاحب نے نہ حواشی لکھے نہ مکتوب الیہم کے حالات پر توجہ فرمائی اور نہ غالب کی خصوصیات نگارش پیش کیں۔ غالباً انھوں نے یہ کام آئندہ کے لیے اٹھا رکھے تھے۔

غرض برسوں کے انتظار کے بعد پھر خیال آیا کہ اپنی سمجھ اور فہم کے مطابق جو کچھ ہو سکتا ہے کر دینا چاہیے، ممکن ہے زیادہ بالغ نظر اور ذی وسائل اہل علم ادھر متوجہ ہوں تو انکے لیے کڑی منزل میں کسی قدر سہولت پیدا ہو جائے چنانچہ یہ مجموعہ مرتب کر دیا اور جتنے متفرق خطوط مل سکے وہ بھی اس مجموعے میں شامل کر دیئے تا کہ غالب کی زیادہ سے زیادہ نثر یکجا ہو جائے۔ اردوے معلی اور عود ہندی کی تقسیم میں توڑ دی اور سارے خطوط اکٹھے کر دیئے۔ آخر میں نامہ غالب اور تقریظیں لگا دیں۔

مشکلات کار

یہ کام سخت مشکل تھا خصوصاً میرے لیے جس کے وسائل تحقیق ویسے بھی محدود تھے اور ملک کی تقسیم کے باعث ہر مقام پر پہنچنا اور ہر ماخذ سے فائدہ اٹھانا سہل نہیں

رہا تھا۔

غالب کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ عام خطوں پر تاریخیں اہتمام سے درج کرتے تھے بلکہ جا بجا ہجری اور عیسوی دونوں تاریخیں لکھیں بعض مقامات پر دن اور وقت تک بھی نظر انداز نہ کیا۔ جب خطوں کی طباعت کے لیے جمع کیا گیا تو میرا خیال ہے کہ اول مکتوب الیہم نے جیسے بے ترتیبی سے رکھ چھوڑے تھے۔ ویسے ہی اٹھا کر بھیج دیئے اور اسی بے ترتیبی سے وہ نقل ہوئے۔، پھر جامعین مکاتیب نے تاریخوں کو عموماً غیر ضروری سمجھ کر حذف کر دیا یا نقل و کتابت میں برابر غلطیاں ہوتی رہیں۔ اس وجہ سے کچھ کم ایک صدی بعد انھیں تاریخ وار مرتب کرنا آسان نہ رہا۔ جن خطوں میں مختلف مطالب درج ہوئے تھے انھیں تو غائر نظر سے دیکھنے کے بعد ہر لحاظ سے یقینی نہیں تو اقرب الی الصواب تاریخ نکال لینا ایک حد تک ممکن تھا۔ لیکن جو خطوط سراپا علمی تھے۔ اور ان میں کوئی بات درج نہیں ہوئی تھی جسے مقابلہ کے لیے سہارا بنایا جا سکتا۔ ان کی تاریخیں نکالنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ بہر حال ان مشکلات کے باوجود جو کام انجام پایا وہ آپ کے سامنے ہے۔ امید ہے کہ پورا نہیں تو بیشتر درست ہوگا۔

عودِ ہندی

جیسا کہ معلوم ہے میرزا غالب ابتدا میں اردو خطوط چھپوانے کے حامی نہ تھے۔ منشی شیونرائن آرام نے ان سے طباعت کی اجازت مانگی تو میرزا نے منع کر دیا۔ سا خیال کو زایل کرنیکا باعث چودھری عبدلغفور سرور مارہروی ہوئے جنھوں نے اپنے

نام کے خطوط مرتب کر کے ان کا نام مہر غالب رکھا اور اس مجموعہ پر ایک دیباچہ بھی لکھ دیا۔ اسمیں زیادہ تر علمی خطوط تھے۔ اس لیے میرزا نے ان کی اشاعت غیر مناسب نہ سمجھی۔ پھر خیال آیا کہ اس انداز کے دوسرے خطوط بھی اس مرقع میں شامل کر دینے چاہیں چنانچہ خواجہ غلام غوث خاں بے خبر میر منشی حکومت آگرہ اودھ کے اہتمام میں علمی خطوط فراہم ہونے لگے۔ خود میرزا بھی علمی انداز کا جو خط لکھتے تھے اس کی نقل خواجہ صاحب کے پاس بھیج دیتے تھے یا مکتوب الیہ کو لکھ دیتے تھے کہ اس کی نقل خواجہ صاحب کو پہنچا دی جائے۔ کئی برس میں یہ مجموعہ تیار ہوا اور طباعت کے لیے منشی ممتاز علی خاں صاحب مالک مطبع مجتبائی کے پاس میرٹھ بھیج دیا گیا۔ یہی مجموعہ ہے جو عودِ ہندی کے نام سے غالب کی وفات سے پونے چار مہینے پیشتر شائع ہوا۔

اردوئے معلیٰ

عودِ ہندی کی اشاعت میں بہت دیر ہوگئی تو دہلی میں میرزا کے مخلص نیاز مندوں نے اردوئے معلیٰ کے نام سے نئے مجموعے کی ترتیب شروع کر دی۔ عودِ ہندی کی پہلی اشاعت کی کاپی کسی اناڑی کاتب نے لکھی تھی اور غلطیاں بہت رہ گئی تھیں نیز اس کی ابتدائی ترتیب صرف علمی خطوط تک محدود تھی۔ اس کے برعکس اردوئے معلیٰ میں ہر قسم کے خط جمع کرنے کی کوشش کی گئی اور خود میرزا غلطیوں کو تصحیح کے لیے موجود تھے۔ یہ مجموعہ اکمل المطابع میں چھپنا شروع ہوا۔ جس کے مالک غلام رضا خاں تھے اور میرزا نے اردوئے معلیٰ کا حق تصنیف بھی انھیں کے حوالے کر

دیا تھا ۔لیکن طباعت میرزا کی وفات کے بعد مکمل ہوئی ۔ اسکا دیباچہ میر مہدی مجروح نے اور خاتمہ میرزا قربان علی بیگ سالک نے لکھا ۔ یہ صرف حصہ اول تھا ۔اگر غالب زندہ رہتے تو دوسرا حصہ بھی مرتب ہو جاتا ۔ انکی وفات کے باعث کام التوا میں پڑ گیا ۔پھر مولوی عبدالاحد صاحب مالک مطبع مجتبائی دہلی پورا اردوے معلیٰ چھاپنے پر آمادہ ہوئے تو ۱۸۹۹ء میں خواجہ حالی نے اپنے فراہم کردہ خطوط انکے حوالے کر دیے ۔اس کا نام اردوے معلیٰ حصہ دوم قرار پایا ۔لیکن یہ الگ کتاب کی صورت میں نہ چھپا بلکہ حصہ اول کے ساتھ شامل ہو گیا ۔

متفرق مجموعے

اس کے بعد میرزا کے متفرق خطوط بھی رسالوں میں چھپتے رہے اور مختلف مجموعے بھی شائع ہوئے مثلاً

۱۔نادر خطوط غالب::

جو مولوی کرامت علی ہمدانی ،صفیر بلگرامی اور صوفی منیری کے نام لکھے گئے ۔ یہ کل ۲۷ خط ہیں ۔

۲۔مکاتیب غالب::

یہ مجموعہ ان خطوط پر مشتمل ہے جو میرزا نے والیان ریاست رام پور کے نام بھیجے تھے اور ریاست کے دفتر میں محفوظ تھے۔ صدیق محترم مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے انھیں انتہائی اہتمام سے مرتب کیا۔ مبسوط فاضلانہ مقدمہ لکھا۔ جس میں پہلی مرتبہ انشائے غالب کی خصوصیات منظر عام پر لائی گئیں اور ٹائپ میں بہ صرف زر کثیر چھپوایا۔ یہ کل ۱۱۷ خطوط ہیں، جن میں سے چار خط فارسی کے ہیں۔ باقی سب اردو کے۔

۳۔ نادرات غالب ::

اس مجموعے میں وہ خطوط ہیں جو میرزا نے نبی بخش حقیر کے نام بھیجے تھے۔ یہ کل ۷۴ ہیں صرف پہلا فارسی کا ہے۔
منشی مہیش پرشاد نے خطوط غالب کے نام سے جو مجموعہ چھاپنا شروع کیا تھا اسکی پہلی جلد میں کئی غیر مطبوعہ رقعے شامل ہو گئے۔ بایں ہمہ نہیں کہا جا سکتا کہ میرزا نے اردو میں جتنے خطوط لکھے تھے وہ سب محفوظ رہے یا منظر عام پر آ گئے۔ بعض مجموعوں کا علم ہو چکا ہے لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کہاں ہیں اور کن کے پاس ہیں۔

اردو خطوں کی ابتداء کا مسئلہ

ایک مسئلہ مدت سے اہل علم کے زیر بحث چلا آتا ہے میرزا نے اردو میں خط لکھنے کی ابتداء کب سے کی؟ خواجہ حالی نے یادگار غالب میں فرمایا تھا کہ قیاس چاہتا

ہے۔ انھوں نے غالباً ۱۸۵۰ء کے بعد سے اردو میں خط لکھنے شروع کیے۔ میرا خیال شروع ہی سے یہ تھا کہ اس بارے میں ۱۸۵۰ء کی تحدید ٹھیک نہ ہوگی۔ اب ۱۸۴۴ء کے لکھے ہوئے خطوط بھی چھپ چکے ہیں اور انکے سامنے رکھ کر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پیشتر بھی میرزا حسب ضرورت اردو میں خط لکھتے رہے ہوں گے۔ اگر چہ وہ محفوظ نہ رہ سکے۔ بہرحال صحیح یہی ہے کہ جب تک اردو کا رواج کم تھا۔ میرزا زیادہ تر فارسی میں خط و کتابت کرتے رہے۔ پھر جیسے جیسے اردو کا رواج بڑھتا گیا اور فارسی کا تدوال کم ہوتا گیا۔ انھوں نے بھی اردو کو ذریعہ مہابرت بنالیا۔ ابتدائی دور کے عام محفوظ خطوط فارسی میں ہیں۔ آخری دور کے زیادہ تر خطوط اردو میں ہیں۔ نہ سارے خط فارسی کے فراہم ہوئے یا محفوظ رہے نہ اردو کے مہر نیمروز کی ترتیب میں کاوش کو بھی اس امر کی دلیل بنایا گیا ہے کہ میرزا ۱۸۵۰ئمیں فارسی خط و کتابت کو چھوڑ کر اردو کو ذریعہ مکاتبت بنانے پر مجبور ہوئے۔ بلاشبہ میرزا نے اس کاوش کے اظہار میں خاصہ سخن گستری فرمائی ہے لیکن اس سے وہ حقیقت نہیں بدل سکتی جو میں اوپر عرض کر چکا ہوں اور جب ۱۸۴۸ء کے لکھے ہوئے اردو خطوط موجود ہیں تو ۱۸۵۰ء پر حصر کا معاملہ خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔ پھر بحث کو طول دینے سے کیا حاصل او یہ خط ایسے شخص کو لکھے گئے جو فارسی کا بہت بڑا عالم تھا۔ یہاں تک کہ میرزا نے دستنبو کے سلسلے میں اسکے متعلق فرمایا تھا کہ اگر اصل میں بھی غلطی ہوگی تو وہ اسے درست کردیگا یعنی منشی نبی بخش حقیر۔

بہرحال میرزا کے اردو مکاتیب کو مکملا تاریخ وار مرتب کرنے اور ان پر تشریحی

حواشی لکھنے کی یہ پہلی کوشش ہے۔ جا بجا قیاس سے بھی کام لینا پڑا۔ اس لیے ممکن ہے کہیں کہیں غلطیاں بھی ہوئی ہوں۔ غلطیوں کا زیادہ امکان ان خطوں میں تھا جو شروع سے آخر تک صرف علمی مباحث پر مشتمل تھے اور ان میں کوئی ایسی بات درج نہ تھی جس سے تعیین تاریخ کے لیے کوئی قرینہ ہاتھ آتا۔ مجھے امید ہے کہ اس ترتیب و تحشیہ کے بعد ۱۸۵۰ء کے خطوط کا مطالعہ زیادہ مفید و دلچسپ بن جائے گا۔

اردو نثر کی مجمل سرگزشت

میرزا نے جب اردو میں خط لکھنے شروع کیے تو اس سے پہلے اردو نثر کے دو مستقل اسلوب موجود تھے ایک سادہ عام فہم اسلوب جس کی مثال میں عام طور پر فورٹ ولیم کالج کی کتابیں پیش کی جاتی ہیں جو ڈاکٹر گل کرسٹ کے زیر اہتمام مرتب ہوئیں لیکن اس سلسلے کی اور کتابیں بھی تھیں مثلاً بائبل کا وہ اردو ترجمہ جو سرام پور میں چھپا۔ شاہ عبدالقادر محدث اور شاہ رفیع الدین محدث کے تراجم قرآن مجید، شاہ اسمٰعیل شہید کی تقویت الایمان جو میرے اندازے کے مطابق ۱۸۱۸ء اور ۱۸۲۰ء کے درمیان لکھی گئی۔ پھر سید احمد شہید بریلوی کے دوسرے مریدوں اور معتقدوں نے عربی کی بعض مذہبی کتابوں کے سلیس اردو ترجمے کیے۔ بیسیوں چھوٹے چھوٹے رسالے عام فہم زبان میں لکھے جن کا مقصد ''تقویت ایمان'' کی طرح یہ تھا کہ اردو پڑھنے والا ہر شخص استاد کی مدد کے بغیر ضروری دینی مسائل سے آگاہ ہو جائے۔ اس طرح سادہ اور عام فہم سلوب تحریر کو خاصی تقویت پہنچی۔ ۱۸۰۷ء میں انشاء نے دریائے لطافت لکھی۔ اس کا انداز تحریر بھی بہت سلیس تھا۔ بایں ہمہ اسے

علمی انداز قرار دیے میں کسی صاحب ذوق کو ایک لمحے کے لیے بھی تامل نہیں ہوسکتا۔

اس کے ساتھ مقفی اور مغلق اسلوب تحریر بھی موجود تھا۔عام اہل قلم کے نزدیک عالمانہ انداز یہی تھا کہ معمولی بات کو تشبیہوں اور استعاروں کے ذریعہ سے مبہم اور پیچدار بنا کر پیش کیا جائے ۔یہ فارسی کے اس اسلوب نگارش کا پرتو تھا جو صدیوں سے ہندوستان میں رائج چلا آتا تھا۔اسمیں تفہیم کے بجائے نمایش علمیت پر زیادہ زور دیا جاتا تھا۔

میرزا غالب کی نثر

میرزا نے اپنے خطوں میں سادہ اور سلیس انداز اختیار کیا۔اس کی ایک وجہ ہے کہ انھوں نے اس زمانے میں اردو مکاتبت شروع کی ،جب فارسی میں ان کی مشاقی اوج کمال پر پہنچ چکی تھی ۔بیان و نگارش کے محاسن ان کے دل و دماغ میں رچ چکے تھے ۔یہ حقیقت ان پر کھل چکی تھی کہ عبارت میں قدم قدم پر پیچ ڈالنا۔نئی نئی ترکیبوں اور نئے نئے استعاروں سے اسے بوجھل بنانا علم وفضل کی نمایش کا صحیح طریقہ نہیں ، بلکہ نفس مطلب ایسے رنگ میں پیش کرنا چاہیے کہ مخاطب بے تکلف اسے سمجھ جائے ۔بایں ہمہ بس سے بہتر اور موزوں تر الفاظ کا انتخاب آسان اور سہل نہ ہو۔اس طرح انھوں نے اپنے انداز کو سہل ممتنع بنا دیا۔

پھر قدرت نے انھیں نکتہ وری اور نکتہ نوازی کے خاص جوہر عطا کیے تھے۔وہ معمولی مطالب بھی لے کر بیٹھتے تو بیان کے حسن ،ابداع کی خوبی اور نکتہ آفرینی کے

کمال کے باعث دلچسپی اور دلاویزی کے نادر پہلو پیدا کر لیتے۔ سادگی اور سلاست کے باوجود انھوں نے اپنی تحریر کو ایسا پرواز دے دیا کہ گزشتہ اسی برس سے ان کی نثر گوناگوں خوبیوں میں ممتاز چلی آتی ہے۔ ان کے بعد ملک میں بڑے بڑے ادیب پیدا ہوئے جن کی تصانیف ہماری زبان کا گراں بہا سرمایا ہیں۔ ان میں اکثر کے مکاتیب بھی چھپ چکے ہیں لیکن ان میں سے کون سا مجموعہ مکاتیب رقعات غالب کے لطائف رنفائش کی ہمہ گیری کا مقابلہ کرسکتا ہے۔ بلکہ کس کی تصنیف میں دل چسپیوں کی وہ فراوانی مل سکتی ہے جو میرزا نے اپنے خطوں میں بے تکلف فراہم کردی۔

تصور عام کی پیروی

لیکن یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ ابتداء میں خود میرزا کو اپنے دل پذیر انداز کی گیرائی کا صحیح احساس نہ تھا۔ منشی شیونرائن آرام اکبرآبادی نے نومبر ۱۸۵۸ء میں ان کے خطوط چھاپنے کا قصہ کیا تو میرزا نے منع کردیا۔ لکھتے ہیں۔

''یہ بھی زائد بات ہے۔ کوئی رقعہ ایسا ہوگا جو میں نے قلم سنبھال کر اردو دل لگا لکھا ہوگا۔ ورنہ صرف تحریے سرسری ہے۔ اس کی شہرت میری سخنوری کے شکورہ کے منافی ہے۔

انھی دنوں میں میرزاہرگوپال تفتہ نے بھی اس بات پر زور دیا ک اردو خطوط چھپ جانے چاہیں۔ میرا خیال ہے کہ منشی شیونرائن اور میرزا تفتہ نے باہم بات چیت کر کے غالب کو لکھا ہوگا۔ تفتہ کو لکھتے ہیں۔

''رقعات کے چھاپنے میں ہماری خوشی نہیں ہے۔لڑکوں کی سی ضد نہ کرو۔اگر تمہاری اس میں خوشی ہے تو صاحب مجھ سے نہ پوچھو تم کو اختیار ہے۔یہ امر میرے خلاف رائے ہے۔''

پھر کیا ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ میرزا نے اردو نثر جو انداز اختیار کیا تھا۔یہ ان کے وسیع ادبی تجربات کا نچوڑ نہ تھا؟ بلکہ اتفاقیہ اور بے ارادہ ان کے قلم سے ٹپک پڑا۔ جب ہر طرف سے مدح وستایش ہونے لگی تو میرزا کو اس کے انوکھے پن کا یقین ہوا۔میرے نزدیک واقعہ یہ ہے کہ شروع میں میرزا کو اپنے خطوط کی اشاعت میں صرف اس وجہ سے تامل تھا کہ اس زمانے میں علم وفضل کو فارسی میں یا اس کے اسالیب کی پیروی میں محدود ومحصور مانا جاتا تھا۔اردو کی علمی حقیقت پوری طرح مسلم نہ تھی لہذا میرزا نے کہا کہ اردو خطوط میری سخنوری کے شکورہ کے آئینہ دار نہیں۔ لیکن جب فارسی کا تداول تیزی سے کم ہو گیا اور اردو سرکاری زبان بن جانے کے باعث دفاتر ومدارس اور علمی جامع میں عام رواج پا گئی تو میرزا کی رائے بھی بدل گئی اور وہ خود اپنے مکاتیب کی فراہمی میں جامعین کے معاون بن گئے۔

اگر میری یہ ناچیز رائے درخور قبول نہ ہو تو سمجھ لینا چاہیے کہ تاجر جب نئی جنس بازار میں لاتا ہے تو اسے پہلے ہی دن یہ یقین نہیں ہوتا کہ جنس واقع گراں ہے اور ضرور ہے کہ قبول عام حاصل کر لے یعنی گاہک دیکھتے ہی اس پر اس طرح گرنے لگیں جس طرح مکھیاں شہد پر گرتی ہیں۔میرزا بھی ابتداء میں کچھ مدت تک مذبذب کی یہ کیفیت طاری رہی ہو گی۔وہ شاعروادیب تھے۔پیغمبر نہ تھے جنھیں پیام کی صداقت،رافادیت کا یقین قدرت کی طرف سے عطا کیا جاتا ہے۔اگر یہ

انداز اتفاقیہ ار بے ارادہ بھی انکے قلم سے تراوش پذیر ہوا تو اسے انھیں کے چمنستان کمال کیا یک بہار مانا جایگا۔

انشاء غالب

میرزا کو قدرت نے صرف شعروادب کے لیے پیدا کیا تھا۔وہ جوہر عطا کیے تھے جو شاذ ہی ایک فرد میں جمع ہوتے ہیں۔اردو نثر پر متوجہ ہونے سے پہلے وہ تیس پینتیس برس تک حریم ادب فارسی کے طواف میں مشغول رہ چکے تھے۔اسی مشغولیت میں ان کے قوائے فکر ونظر نے نشوو بلوغ کی منزلیں طے کیں او اسالیب بیان کے دقائق و معارف پر انھیں عبور حاصل ہوا۔فارسی کے خزینہ ادب میں صدیوں سے حسن کلام اور لطافت ادا کے جوشہوار گوہر جمع ہوتے رہے تھے۔میرزا نے نہ محض انھیں درج حافظہ میں جمع کیا بلکہ ایک بالغ نظر جوہری کی طرح ان گوہروں سے دو قرنوں تک طرز وآرائش کے نئے نئے شیوے اور نئے نئے انداز پیدا کرتے رہے۔فارسی ادب ایشیا بھر میں وقت کا بہترین ادب مانا جاتا تھا اور یہی ادب تھا جو ایران ،ترکستان ،افغانستان اور ہندوستان کا مشترکہ علمی سرمایہ تھا میرزا اس کی پوری دولت سمیٹ لینے کے بعد اردو کی فضا میں ابر گہر بار بن کر نمودار ہوئے۔زبان کی لطافت ۔الفاظ کی موزونی ۔بیان کے حسن اور تراکیب کی دل آویزی کے اسرار ان پر روشن ہو چکے تھے۔وہ معانی کے دریا کو عبارت کے کوزے میں بند کرنے کی ہنرمندی میں کمال بہم پہنچا چکے تھے۔ادب میں یہ مقام بلند ہر صاحب تحریر اور ہر اہل قلم کو میسر نہیں تھا۔لفظ جوڑ کر فقرے تیار کر لینا یا پیش نظر

مطالب کو الفاظ کا لباس پہنا دینا آسان ہے۔ لیکن لفظوں کی معنویت کے دقائق کا صحیح اندازہ کرتے ہوئے ان سے موقع او رمحل پر کام لینا سہل نہیں۔ اس بارے میں میرزا نے کیا خوب فرمایا:

نے ہر ترانہ نکیسا نوا بود
نے ہر سخن سرائے بہ سحباں برابر است
نے ہر شتر سوار بہ صالح بو ہمال
نے ہر شباں بہ موسیٰ عمراں برابراست
گفتی کہ ایں و آں بود راز نطق مایہ در
ایں درشمار شیوہ نہ باآں برابر است
گفتی کہ ایں و آں بود از نطق مایہ ور
این درشمار شیوہ ساعت بہ رجواں برابراست
گیرم کہ ہر گیہ برواز بار و باد فیض
خرزہرہ کے بہ سنبل و ریحاں برابرست

بے تکلفی ارو بے ساختگی

میرزا کے انداز نگارش کی ممتاز ترین خصوصیت یہ ہے کہ وہ جو کچھ لکھتے تھے۔ بے تکلف لکھتے تھے۔ انکے خطوط کا مطالعہ کرتے وقت شاید ہی کہیں یہ احساس ہو کہ الفاظ کے انتخاب یا مطالب کی تلاش و جستجو میں انھیں کاوش کرنی پڑی۔ برابر یہ محسوس ہوتا ہے کہ مطالب دلکش الفاظ کا لباس پہن کر اسی طرح بہے چلے آرہے

ہیں جس طرح فوارے کا منہ کھل جانے سے پانی خود بخود اچھلا چلا آتا ہے۔ عام ادبی بول چال کا سہارا لے کر کہہ سکتے ہیں کہ میرزا کے اردو خطوط سراسر آمد تھے۔ آورد سے ان کا دامن یک قلم پاک تھا۔ وہ خود لکھتے

''ہنجار من در نگارش ایں است کہ چو کلک و ورق بہ کف گیرم، مکتوب الیہ را بہ لفظے کہ در خور حالت اوست دسر آغاز صفحہ آوازہ ہم و زمزمہ سنج مدعا گردم۔ القاب و آداب و خیریت گوئی و عافیت جوئی حشو و زوئد است و پخشگان حشو را دفع نہند۔''

اس بے تکلفی اور عام رسم و راہ سے علیحدگی کا جامع ترین مرقع ان کے اردو کے خطوط ہیں۔ اگر مثالیں دی جائیں تو مکاتیب کے بڑے حصے کو یہاں دہرانا پڑے۔ تاہم چند نمونے ملاحظہ فرمالیجے۔

۱۔ منشی شیو نرائن آرام سے ارسال جواب میں تاخیر ہوئی۔ فرماتے ہیں:

''بھائی یہ بات تو کچھ نہیں کہ تم خط کا جواب نہیں لکھتے۔ خیر دیر سے لکھو۔ اگر شتاب نہیں لکھتے۔

۲۔ میرزا تفتہ نے خط لکھنے میں دیر کر دی تو فرماتے ہیں:

''کیوں صاحب، کیا یہ آئین جاری ہوا ہے کہ سکندر آباد کے رہنے والے دلی کے خاک نشینوں کو خط نہ لکھیں؟ اگر یہ حکم ہوا ہوتا تو یہاں بھی اشتہار ہو جاتا۔ کہ زنہار کوئی خط سکندر آباد کی ڈاک میں نہ جائے۔

۳۔ انور الدولہ شفق نے قصیدہ بغرض اصلاح بھیجا۔ میرزا نے درستی کے بعد اسے واپس کر دیا۔ شفق نے کٹے ہوئے اشعار کی قباحت پوچھی۔ میرزا نے بتادی۔

ایک رقعہ کسی اور صاحب کے نام بھیجا تھا۔ میرزا نے اس کا جواب لے کر ارسال کر دیا شفق نے پھر شکایت کی۔ میرزا جواب فرماتے ہیں:

"پیر و مرشد، بارہ بجے تھے، میں ننگا پلنگ پر لیٹا ہوا حقہ پی رہا تھا ایک آری نے آ کر خط دیا۔ میں نے کھولا۔ بھلے کو انگرکھا یا کرتا گلے میں نہ تھا۔ اگر ہوتا تو گریبان پھاڑ ڈالتا۔ حضرت کا کیا جاتا میرا نقصان ہوتا۔"

۴۔ میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں۔

۵۔ مجروح کے نام ایک اور خط اس طرح شروع ہوتا ہے۔

"او میاں سید زادہ آزادہ، دلی کے عاشق دلدادہ، ڈھے ہوئے اردو بازار کے رہنے والے، حسد سے لکھنو کو برا کہنے والے۔ نہ دل میں مہر و آزرم، نہ آنکھ میں حیا و شرم۔

جدت:

جدت میرزا کے پورے کلام نظم و نثر کی جان ہے وہ کوئی بھی بات عام اور فرسودہ انداز میں نہیں کہتے۔ انتہا یہ ہے کہ تقریباً ہر خط میں مکتوب الیہ کو نئے طریق پر خطاب کرتے ہیں مثلاً میرا مہدی کے نام کے بعض خطوں کی ابتدائی عبارتیں ملاحظہ فرمائیے۔

بھائی۔ تم سچ کہتے ہو۔ بر سر فرزند آدم ہر چہ آید بگزرد۔

۲۔ نور چشم میر مہدی کے بعد دعا ہو کر کلیات فارسی کا پہنچا مجھ کو معلوم ہوا۔

۳۔ برخوردار کامگار میر مہدی علی دہلوی اردو بازار کے مولوی صاحب لوائے

ولائے مرتضوی پر علم عباسؓ ابن علیؑ کا سایہ۔

۴۔ صاحب وہ خط تمہارے بہ سبیل ڈاک آئے۔ کل دوپہر ڈھلے ایک صاحب اجنبی سانولے سلونے ڈاڑھی منڈے، بڑی بڑی آنکھوں والے تشریف لائے، تمہارا خط دیا۔

۵۔ میاں تم کو پنسن کی کیا جلدی ہے۔ ہر بار پنسن کو کیوں پوچھتے ہو۔ پنسن جاری ہو اور میں تم کو اطلاع نہ دوں؟

۶۔ میر مہدی تم میری عادت کو بھول گئے؟ ماہ مبارک میں کبھی مسجد جامع کی تراویح ناغہ ہوئی ہے؟ میں اس مہینے میں رام پور میں کیوں رہتا؟

۷۔ جو یائے حال وہی، سلام لو جامع اگزاوشت ہوگئی۔ چتلی قبر کی سیڑھیوں پر کبابیوں نے دکانیں بنالیں۔ انڈا، مرغی، کبوتر بکنے لگا۔

۸۔ لو صاحب۔ یہ تماشہ دیکھو۔ میں تم سے پوچھتا ہوں کہ میر سرفراز حسین اور میر نصیر الدین کہاں ہیں، حالانکہ میر نصیر الدین شہر میں ہیں اور م جھ سے نہیں ملے۔ میر سرفراز حسین آئے ہیں اور میرے ہاں نہیں اترے۔

۹۔ میاں لڑکے، کہاں پھر رہے ہو۔ ادھر آؤ خبریں سنو۔

۱۰۔ اہاہاہا۔ میرا پیارا مہدی آیا۔ آؤ بھائی مزاج تو اچھا ہے۔؟

۱۱۔ آئیے جناب میر مہدی صاحب دہلوی۔ بہت دنوں میں آئے۔ کہاں تھے؟ بارے آپ کا مزاج تو خوش ہے؟

۱۲۔ مار ڈالا یار تیری جواب طلبی نے اس چرخ کی رفتار کا برا ہو۔ ہم نے اس کا کیا بگاڑا تھا۔

لطف یہ کہ جس قسم کے مطالب پیش نظر ہوتے ہیں۔ اسی رنگ کا خطاب ہوتا ہے۔ عام خطوں کی کیفیت یہی ہے۔

میر مہدی کے نام ایک خط لکھا۔ جس کی ابتداء یوں ہے۔

''میرن صاحب السلام علیکم۔

''حضرت آداب۔''

''کہو صاحب آج اجازت ہے میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کی؟

غرض اسی طرح میرن صاحب سے مکالمہ چلا آتا ہے۔ بادی النظر میں خط میرن کے نام معلوم ہوگا لیکن ہے میر مہدی کے نام۔

اسی طرح نواب علاؤالدین خاں کے چند خطابات ملاحظہ فرمائیے۔

۱۔ جانا جانا۔

۲۔ میرزا علائی۔

۳۔ علائی مولائی۔

۴۔ میری جان علائی • ہمدان۔

۵۔ جان غالب مگر جسم سے نکلی ہوئی جان۔

اپنا نام لکھنے کے طریقے

طریق خطاب کے نئے نئے رنگ آپ نے دیکھ لیے۔ اپنا نام بھی وہ اکثر عجیب وغریب انداز میں ظاہر کرتے ہیں، مثلاً۔

۱۔ خواجہ غلام غوث بے خبر کے نام۔

قبلہ آپ کو کبھی یہ بھی خیال آتا ہے کہ ہمارا دوست، جو غالب کہلاتا ہے وہ کیا کھاتا پیتا ہے اور کیونکہ جیتا ہے؟

۲۔ انوالدولہ شفق کے نام:

واہ کیا ہوش مندی ہے کہ قبلہ ارباب ہوش کو خط لکھتا ہوں نہ القاب نہ آداب نہ بندگیح نہ تسلیم سن غالب ہم تجھ سے کہتے ہیں۔مصاحب نہ بن۔''

۳۔ علاؤالدین احمد علائی کے نام:

''دن، تاریخ صدر میں لکھ آیا ہوں۔کاتب کا نام، غالب ہے کہ دستخط سے پہچان جاؤ۔''

۴۔ علائی کے نام۔

''تاریخ اوپر لکھ کر آیا ہوں۔بدل کر مغلوب رکھ لیا ہے۔

پھر کہیں فقیری کا رنگ اختیار کر کے اپنے آپ کو غالب علی شاہ لکھتے ہیں اکثر نجات کا طالب، غالب تحریر فرماتے ہیں۔

انداز مکالمت

میرزا کے مکاتیب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے تحریر میں مکالمت کا رنگ پیدا کر دیا تھا۔میرزا حاتم علی بیگ مہر کو لکھتے ہیں۔

''میرزا صاحب، میں وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بزبان قلم باتیں کیا کرو۔ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔''

تفتہ کو بھی لکھتے ہیں:

''بھائی تم میں مجھ میں نامہ نگاری کا ہے کو ہے۔مکالمہ ہے۔''

غلام نجف خاں، انوالادولہ شفق، خواجہ غلام غوث خاں بے خبر وغیرہ کے خطوں میں بھی اس قسم کے اول کے خطوں کا عام انداز ہی مکالمے اور بات چیت کا ہے۔ کہیں کہیں با قاعدہ مکالمے بھی لکھے ہیں مثلاً۔

ا۔ مجروح کو لکھتے وقت، آغاز میرن صاحب کے ساتھ مکالمے سے کیا ہے اور پوری بات چیت لکھ دی ہے۔

''اے میرن صاحب، السلام علیکم''

''حضرت، آداب،

''کہو صاحب، آج اجازت ہے میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کی؟''

''حضور، میں کیا منع کرتا ہوں مگر میں اپنے ہر خط میں آپ کیطرف سے دعا لکھ دیتا ہوں پھر آپ کیوں تکلیف کریں؟''

''نہیں میرن صاحب، اس کے خط کو آئے ہوئے بہت دن ہوئے ہیں۔وہ خفا ہو ہوگا۔جواب لکھنا ضرور ہے۔''

''حضرت، وہ آپ کے فرزند ہیں۔آپ سے خفا کیا ہوں گے۔''

''بھائی، آخر کوئی وجہ تو بتلاؤ کہ تم مجھے خط لکھنے سے کیوں باز رکھتے ہو؟''

''اچھا تم باز نہیں رکھتے۔مگر یہ کہو کہ تم کیوں نہیں چاہتے کہ میر مہدی کو خط لکھوں۔''

''کیا عرض کروں؟ سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا اور وہ پڑھا جاتا تو میں سنتا اور خط اٹھاتا۔اب جو میں وہاں نہیں ہوں تو نہیں چاہتا کہ آپ کا خط

جاوے۔"

۲۔ علائی کو یہ اطلاع دینا چاہتے ہیں کہ ان کی والدہ، بیگم اور فرزند نہ ہونے والے ہیں۔ فرماتے ہیں:

"میرا منظر سرا رہ ہے۔ وہاں بیٹھا ہوا خط لکھ رہا ہوں۔ محمد علی بیگ ادھر سے نکلا۔"

"بھئی محمد علی بیگ، لوہارو کی سواریاں روانہ ہو گئیں؟"

"حضرت، ابھی نہیں۔"

"کیا آج نہ جائیں گی؟"

"آج ضرور جائیں گی تیاری ہو رہی ہے۔"

ان با قاعدہ مکالموں کے علاوہ بھی بیسیوں مثالیں مل جائیں گی جن میں ایسا اندازہ اختیار کیا گیا ہے گویا مکتوب الیہ سامنے بیٹھا ہے اور اس سے بے تکلف باتیں کر رہے ہیں۔ مثلاً:

۱۔ میر مجروح کے نام:

"یہاں، کیوں ناسپاسی و حق شناسی کرتے ہو، چشم بیمار ایسی چیز ہے کہ کوئی شکایت کرے، تمہارا منہ چشم بیمار کے لائق کہاں؟ چشم بیمار میرن صاحب قبلہ کی آنکھ کو کہتے ہیں جس کو اچھے اچھے عارف دیکھتے رہتے ہیں۔ تم گنوار چشم بیمار کو کیا جانو؟"

۲۔ میر مجروح کے نام:

"اہا ہا ہا، میرا پیارا میر مہدی آیا آؤ بھائی مزاج تو اچھا ہے، بیٹھو یہ رام پور

ہے یہ دارالسرور ہے۔ جو لطف یہاں ہے وہ اور کہاں ہے۔''

۳۔ تفتہ کے نام:

''کیوں مہاراج کول میں آنا اور جناب منشی نبی بخش کے ساتھ غزل خوانی کرنی اور ہم کو یاد دلانا مجھ سے پوچھو کہ میں نے کیونکر چلانا تم مجھ کو بھول گئے کول میں آئے اور مجھے اپنے آنے کی اطلاع نہ دی۔ نہ لکھا کہ کیونکر آیا ہوں اور کب آیا ہوں اور کب تک رہوں گا اور کب چلا جاؤں گا اور بابو صاحب سے کہاں جاملوں گا؟''

ایسی مثالیں آپ کو جا بجا ملیں گی۔ مکاتیب میں حسن تحریر کا کمال یہی ہے کہ ان میں باقاعدہ گفتگو کی شان پیدا کر دی جائے میرزا اس وصف میں سب سے منزلوں میں آگے نکل گئے۔

ذات اور ماحول

میرزا کا ایک کمال یہ ہے کہ وہ اثنا تحریر میں ذاتی حالات اور ماحول کی جزئیات اس بے ساختگی سے بیان کر جاتے ہیں کہ دوران مطالعہ میں شاید یہ محسوس نہ ہو، اپنے متعلق کیا کچھ لکھ دیا۔ لیکن پورے مکاتیب کو سامنے رکھ کر حیات غالب کا مکمل نقشہ تیار کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً یہ کہ وہ کب اور کہاں پیدا ہوئے؟ خاندان کی کیفیت کیا تھی؟ وسائل معاش کیا تھے؟ کہاں کہاں سے پیسے ملتے رہے، کن کن مکانوں میں رہے؟ کن کن لوگوں سے کس کس قسم کے تعلقات تھے؟ قلعے کب جاتے تھے؟ کھاتے پیتے کیا تھے۔ رات دن کی مشغولیت کا کیا حال تھا؟ کن کن

بیماریوں سے واسطہ پڑا۔آخری عمر میں ضعف کس رفتار سے ترقی کرتا رہا۔نظم ونثر کی اصلاح کا طریقہ کیا تھا؟ اخلاق کیسے تھے کن کن مقامات کے سفر کیے؟غرض ان کی زندگی کا شاید ہی کوئی پہلو ایسا ہو،جس کے متعلق ان کے قلم سے معلومات کا گراں بہا ذخیرہ فراہم نہ ہوا ہو اور یہ ظاہر ہے کہ ذاتی حالات کی تسوید ان کے پیش نظر نہ تھی۔

اسی طرح دہلی اور بعض دوسرے مقامات کے حالات ان کے خطوں میں بہ کثرت موجود ہیں۔عام ملکی حالات کے متعلق بھی خاصی معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔انھوں نے غدر کے نتائج وعوقب پر بیسیوں خطوں میں بحث کی ہے اور جو نقشہ پیش کر دیا ہے وہ کسی دوسری جگہ نہیں مل سکتا۔

نواب میر غلام بابا خاں نے جشن کے سلسلے میں صورت آنے کی دعوت دی۔ جواب میں لکھتے ہیں:

''رقعہ گلگوں نے سیر کی بہار دکھلائی بہ سواری ریل روانہ ہونے کی لہروں میں آئی۔پاؤں سے اپاہج کانوں سے بہرا ضعف بصارت،ضعف دماغ ضعف دل، ضعف معدہ۔ان سب ضعفوں پر ضعف طالع۔کیونکر قصد سفر کرو،تین چار شبانہ روز قفس میں کس طرح بسر کروں؟''

اس طرح بیان کر گئے کہ ۱۸۶۰ میں ریل کے ذریعے سے سورت پہنچنے میں تین چار دن صرف ہوتے تھے۔ایک اور خط میں رام پور سے لکھتے ہیں۔

''میں حسب الطلب نواب صاحب کے دوستانہ آیا ہوں اور اپنی صفائی بذریعہ کے گورنمنٹ سے چاہتا ہوں۔دیکھوں کیا ہوتا ہے۔کتاب (دستنبوے)اور عرضی

اواسط ماہ جنوری ۱۸۶۰ء میں ولایت کو روانہ کرکے یہاں آیا ہوں چھ ہفتے میں جہاز پہنچتا ہے یقین ہے کہ پارسل ولایت پہنچ گیا ہوگا۔

اس طرح بتا دیا کہ ۱۸۶۰ میں جہاز ڈیڑھ مہینے میں ہندوستان سے ولایت پہنچتا تھا۔ایسی معلومات ان کے مکاتیب سے بہ کثرت نکالی جاسکتی ہے۔

منظر کشی

میرزا کا ایک کمال یہ ہے کہ وہ جو کچھ بیان کرتے ہیں اس کو تصویر لفظوں میں اس طرح کھینچ دیتے ہیں کہ شاید رنگ و روغن کی تصویر میں نہ وہ جزئیات سما سکیں اور نہ اس میں وہ روح تاثیر پیدا ہو۔اس کی مثالیں بہت زیادہ ہیں۔میں صرف چند پر اکتفا کروں گا۔

۱۔ میر مہدی مجروح کے نام:

''برسات کا حال نہ پوچھو۔خدا کا قہر ہے۔قاسم جان کی گلی سعادت خاں کی نہر ہے۔میں جس مکان میں رہتا ہوں۔عالم بیگ کے کٹرے کی طرف دروازہ گر گیا۔مسجد کی طرف کے دالان کا جو دروازہ تھا۔گر گیا۔سیڑھیاں گرا چاہتی ہیں۔صبح کے بیٹھنے کا حجرہ جھک رہا ہے چھتیں چھلنی ہوگئی ہیں۔مینہ گھڑی بھر برسے تو چھت گھنٹہ بھر برسے۔

۲۔ میرزا حاتم علی بیگ مہر کے نام:

''تمہارا حلیہ دیکھ کر تمہارے کشیدہ قامت ہونے پر مجھ کو شک نہ آیا،کسی واسطے کو میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے تمہارے گندمی رنگ پر رشک نہ

آیا کس واسطے کو جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چمپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اس کی ستایش کیا کرتے تھے۔ اب جو کبھی مجھ کو وہ اپنا رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے۔ ہاں مجھ کو رشک آیا اور میں نے خون جگر کھایا تو اس بات پر کہ ڈاڑھی گھٹی ہوئی ہے۔ وہ مزے یاد آ گئے۔ کیا کہوں، جی پر کیا گزری، بقول شیخ علی حزیں:

تار ستر بود زوم چاک گریباں
شرمندگی از خرقہ پشمینہ ندارم

جب ڈاڑھی مونچھ میں بال سفید آ گئے۔ تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ ناچار مستی بھی چھوڑ دی اور ڈاڑھی بھی۔ مگر یاد رکھیے۔ اس بھونڈے شہر میں ایک وردی ہے۔ حام ملا، حافظ بساطی۔ نیچہ بند دھوبی سقا بھٹیارہ، جولاہا، کنجڑا۔ منہ پر ڈاڑھی سر پر بال، فقیر نے جس دن ڈاڑھی رکھا اس دن سر منڈایا۔"

۳۔ ہر گوپال تفتہ کو لکھتے ہیں کہ میں کرایے کے جس مکان میں رہتا تھا، مالک نے وہ بیچ ڈالا۔

"جس نے لیا۔ اس نے مجھ پر پیام بلکہ ابرم کیا کہ مکان خالی کر دو۔ مکان کہیں ملے تو اٹھوں۔ بید رر نے مجھ کو عاجز کیا اور مدد لگانہ دی۔ وہ صحن بالا خانے کا جس کا دو گز کا عرض اور دس گز کا طول ہے اس میں پاڑ بندھ گئی۔ رات کو وہیں سویا۔ گرمی کی شدت پاڑ کا قرب، گمان یہ گزرتا تھا کہ یہ کٹہرا ہے اور صبح کو مجھے پھانسی ملے گی۔

۴۔ میر مہدی مجروح کے نام:

"برسات کا نام آ گیا۔ سو پہلے تو مجملا سنو۔ ایک غدر کالوں کا، ایک ہنگامہ گوروں کا ایک فتنہ انہدام مکانات کا ایک آفت وبا کی، ایک مصیبت کی کال کی۔ اب یہ برسات جمیع حالات کی جامع ہے۔ آج اکیسواں دن ہے۔ آفتاب اس طرح نظر آ جاتا ہے۔ جس طرح بجلی چمک جاتی ہے رات کو کبھی کبھی اگر تارے دکھائی دیتے ہیں تو لوگ ان کو جگنو سمجھ لیتے ہیں۔ مبالغہ نہ سمجھیے، ہزارہا مکان گر گئے۔ سیکڑوں آدمی جا بجا دب کر مر گئے۔ گلی گلی ندی بہہ رہی ہے قصہ مختصر وہ ان کال تھا کہ مینہ نہ برسا، اناج نہ پیدا ہوا۔ یہ پن کال ہے کہ پانی ایسا برسا، بوئے بوئے دانے بہہ گئے جنھوں نے نہیں بویا تھا، وہ بونے سے رہ گئے۔ سن لیا دلی کا حال؟"

جزئیات نگاری

میرزا کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ جزئیات کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ مفصل بیانات عموماً بے لطف ہو جاتے ہیں، لیکن میرزا جزئیات کو اس ڈھنگ سے پیش کرتے ہیں کہ تحریر بے مزہ ہونے کے بجائے زیادہ پر لطف بن جاتی ہے۔ اس کی مثالیں بے شمار ہیں۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

۱۔ غدر کے بعد نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ قید سے رہا ہوئے۔ میرزا مہدی مجروح کو لکھتے ہیں:

"میں بہ مجرد استماع اس خبر کے ڈاک میں بیٹھ کر میرٹھ گیا۔ ان کو دیکھا۔ چار

دن وہاں رہا۔ پھر ڈاک میں اپنے گھر آیا۔ تاریخ آنے جانے کی یاد نہیں۔ مگر ہفتے کو گیا، منگل کو آیا۔ آج بدھ دوم فروری ہے۔ مجھ کو آئے ہوئے نواں دن ہے:۔

۲۔ اسی خط میں آگے چل کر لکھتے ہیں۔

''میرٹھ سے آکر دیکھا کہ یہاں بڑی شدت ہے اور یہ حالت ہے کہ گوروں کی پاسبانی پر قناعت نہیں ہے۔ لاہور دروازے کا تھانیدار مونڈھا بچھا کر سڑک پر بیٹھا ہے جو باہر کے گورے کی آنکھ بچا کر آتا ہے اس کو پکڑ کر حوالات میں بھیج دیتا ہے۔ حاکم کے ہاں پانچ پانچ بید لگتے ہیں یا دو روپے جرمانہ لیا جاتا ہے۔ آٹھ دن قید رہتا ہے۔''

۲۔ شہاب الدین احمد خاں ج ثاقب کے نام بہ سلسلہ سفر رام پور۔

''دو دن گھڑی دن چڑھے احباب کو رخصت کر کے راہی ہوا۔ قصد یہ تھا کہ پلکھوے رہوں۔ وہاں قافلے کی گنجائش نہ پائی۔ پاپوڑ کو روانہ ہوا۔ دونوں برخوردار باقر علی اور حسین علی، گھوڑوں پر سوار پہلے چل دیے۔ چار گھڑی دن رہے ہیں ہاپوڑ اہ کی سرائے میں پہنچا۔ دونوں بھائیوں کو بیٹھے ہوئے اور گھوڑوں کو ٹہلتے ہوئے پایا۔ گھڑی بھر دن رہے قافلہ آیا۔ میں نے چھٹانک بھر گھی داغ کیا۔ دو شامی کباب اس میں ڈال دیے رات ہو گئی تھی۔ شراب پی پی، کباب کھا لیے۔ لڑکوں نے ارہر کی کھچڑی پکوائی۔ خوب گھی ڈال کر آپ بھی کھائی اور سب آدمیوں کو بھی کھلائی۔ دن کے واسطے سادہ سالن پکوا لیا۔ ترکاری نہ ڈلوائی۔ چار پانچ کے عمل میں ہاپوڑے سے چل دیا۔ سورج نکلے بابوگڑھ کی سرائے میں آ پہنچا۔ چارپائی بچھائی۔ اس پر بچھونا

بچھا کر حقہ پی رہا ہوں اور یہ خط لکھ رہا ہوں۔"

ظاہر ہے کہ ان جزئیات نے ان کے خط کو ایک زندہ جاندار شے بنا دیا یا سمجھ لیجئے ان کا خط کا پردہ تھا۔ جس پر ثاقب نے میرزا کے سفر کو اس رنگ میں دیکھ لیا گویا وہ ساتھ تھا۔

نکتہ آفرینی

میرزا ہر بات میں سے دل چسپ اور لطیف نکتے پیدا کر لیتے ہیں۔ مثلاً:

ا۔ چودھری عبدالغفور سرور مارہروی بیمار ہو گئے صاحب عالم مارہروی نے اپنے خط میں ان کی علالت کا حال لکھا۔ میرزا چودھری صاحب کو لکھتے ہیں۔

"آپ نے مزاج کی ناسازی کا حال کچھ نہ لکھا ہے۔ اگر پیر و مرشد بھی نہ لکھتے تو میں کیونکر اطلاع پاتا اور اگر اطلاع نہ پاتا تو حصول صحت کی دعا کیونکر مانگتا، کل سے وقت خاص میں دعا مانگ رہا ہوں۔ یقین ہے پہلے تو تندرست ہو جاؤ گے۔ زاں بعد یہ خط پاؤ گے۔

۲۔ چودھری عبدالغفور سرور کے نام:

"تمہارے روزگار نے مجھ کو گھیر لیا ہے۔ سانس نہیں لے سکتا، اتنا تنگ کر دیا ہے۔ ہر بات سو طرح سے خیال میں آئی۔ پر دل نے کبھی تسلی نہ پائی۔ اب دو باتیں سوچا ہوں۔ ایک تو یہ کہ جب تک جیتا ہوں۔ یوں ہی در یا کروں گا۔ دوسری یہ کہ آخر ایک دن مروں گا۔ یہ صغری و کبری دل نشین ہے نتیجہ، اسکا تسکین ہے۔

۳۔ میرزا نے چالیس پنتالیس برس کی عمر میں اپنی وفات کے متعلق ایک قطعہ کہا تھا جس سے ۱۲۷۷ھ میں مرجاؤں گا لیکن موت کسی شاعر کے قطعہ وفات کی پابند نہیں ہو سکتی۔ وہ نہ مرے، اتفاق سے اسی سال ہیضہ پھیلا۔ فرماتے ہیں۔ ''وبائے عام میں مرنا میرے لیے باعث کسر شان تھا۔''

صاحب عالم ہردی نے ان کی مدح میں شعر کہے۔ انھیں لکھتے ہیں

''خدا کی بندنوازیاں ہیں کہ مجھ ننگ آفرینش کو خاصان درگاہ سے بھلا کہلواتا ہے ظاہرا میرے مقدر میں یہ سعادت عظمیٰ تھی کہ میں اس وبائے عام میں جیتا رہا۔ اللہ اللہ! ایسے کشتی وسوختنی کو یوں بچایا اور پھر اس رتبے کو پہنچایا۔ واسطے خدا کے اور اشعار نہ فرمایئے گا ورنہ بندہ دعوائے خدائی کرنے میں محابا نہ کرے گا۔''

۴۔ میر سرفراز حسین کے نام:

''تمہارے دستخطی خط نے میرے ساتھ وہ کیا کہ جو پورے پیرہن نے یعقوبؑ کے ساتھ کیا۔ میاں یہ ہم تم بوڑھے ہیں یا جوان ہیں۔ توانا ہیں یا ناتواں ہیں۔ بڑے بیش قیمت ہیں۔ یعنی بہ ہر حال غنیمت ہیں۔ کوئی جلا بھنا کہتا ہے:

یاد گار زمانہ ہیں ہم لوگ
یاد رکھنا فسانہ ہیں ہم لوگ

وہی بالا خانہ اور وہی میں ہوں۔ سیڑھیوں پر نظر ہے کہ وہ میر مہدی آئے۔ وہ میر سرفراز حسین آئے۔ وہ میرن آئے وہ یوسف علی خاں آئے۔ مرے ہوؤں کا

نام نہیں لیتا۔ بچھڑے ہوؤں میں سے کچھ گنے ہیں اللہ ہزاروں ل کا میں ماتم دار ہوں۔ میں مروں گا تو مجھ کو کون روئے گا؟

۵۔ نواب علاؤالدین خاں علائی کے نام:

''دو جانہ میں میرا انتظار اور میرے آنے کا تقریب شادی پر مدایہ بھی شعبہ ہے انھیں ظنون کا، جن سے تمہارے چچا (ضیاء الدین احمد خاں نیر) کو گمان ہے مجھ پر جنون کا۔ جاگیر میں نہ تھا کہ ایک جاگیر دار مجھ کو بلاتا۔ گویا میں نہ تھا کہ اپنا ساز و سامان لے کر چلا جاتا۔ وہ جانہ جا کر شادی کماؤں اور پھر اس فصل میں کہ دنیا کرہ نار ہون۔ لوہار بھائی کے دیکھنے کو نہ جاؤں اور پھر اس موسم میں کہ جاڑے کی گرمی بازار ہو۔''

۶۔ نواب علائی کے نام:

''استاد میر جان کو اس راہ سے کہ میری پھوپی ان کی چچی تھیں اور وہ مجھ میں چھوٹے ہیں۔ دعاء اور اس وجہ سے کہ دوست ہیں اور دوستی میں کمی بیشی سن و سال کی رعایت نہیں کرتے۔ سلام اور اس سبب سے کہ استاد کہلاتے ہیں، بندگی اور اس نظر سے کہ یہ سید ہیں درود۔ اور موافق اس مصرع کے:

''نسوی اللہ واللہ مافی الوجود'' سجود۔''

شکوہ اور معذرت

۱۔ میرزا حاتم علی بیگ مہر کے نام:

''بندہ پرور۔ فقیر شکوے سے برا نہیں مانتا۔ مگر شکوے کے فن کے سوا

میرے کوئی نہیں جانتا شکوے کی خوبی یہ ہے کہ راہ راست سے منہ نہ موڑے
اور معہذا دوسرے کے واسطے جواب کی گنجائش نہ چھوڑے۔''

سوچیے کہ شکوے کی تعریف اس سے بہتر کیا ہوسکتی ہے۔ شکوہ حقیقت یہی ہے محض دوسرے پر الزام دھرنے کے اضطراب کو ''شکوہ'' قرار دینا بالکل غلط ہوگا۔

۲۔ بعض اوقات شکایت کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میں ابھی شکایت نہیں کرتا۔ مثلاً حاتم علی بیگ مہر کو دو ایک کاموں کے لیے لکھا تھا جو مشکل نہ تھے۔ وہ نہ ہو سکے تو ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ابھی شکایت نہیں کرتا، پوچھتا ہوں کہ یہ امور یقینی شکایات ہیں یا نہیں۔''

۳۔ شکایت کا ایک لطیف طریقہ میرزا نے تفتہ کے نام ایک خط میں اختیار کیا ہے پورے ان کے لیے پانسو روپے مع خلعت تجویز ہو چکے تھے۔ متوسط نے اطلاع بھیجی کہ ہولی کے بعد لے کر چلو گا۔ یہ وعدہ پورا نہ ہوا۔ میرزا کو روپے کی کیا ضرورت تھی۔ تفتہ کو جو متوسط کے دوست تھے لکھتے ہیں۔

''بھاگن جیت بیساکھ نہیں معلوم ہولی کس مہینے میں ہوتی ہے۔ آگے تو پھاگن ہوتی تھی۔''

۴۔ میرا تاریخیں کہنے سے بہت گھبراتے تھے۔ ایک مرتبہ نواب علاؤالدین احمد خاں کو لکھا۔

''میں مادہ تاریخ نکالنے میں عاجز ہوں۔ لوگوں کے مادے دیے ہو۔ نظم کر دیتا ہوں۔ اور جو مادہ اپنی طبیعت سے پیدا کرتا ہوں وہ بیشتر لچر ہوا کرتا ہے۔''

نواب موصوف نے ایک مرتبہ اپنے نومولد فرزند کا تاریخی نام تجویز کرنے اور تاریخ ولادت کہنے کی فرمائش کی میرزا معذرت کرنا چاہتے تھے۔ اسکے لیے نیا طریقہ اختیار کیا:

"شیر اپنے بچوں کو شکار کا گوشت کھلاتا ہے۔ طریق جید اقلی سکھاتا ہے۔ جب وہ جوان ہو جاتے ہیں تو آپ شکار کھاتے ہیں۔ تم سخنور ہو گئے حسن طبع خداداد رکھتے ہو۔ ولادت فرزند کی تاریخ کیوں نہ کہو؟ اسم تاریخی کیوں نہ نکال لو کہ مجھ پر غمزدہ دل مردہ کو تکلیف ہو علاؤالدین خاں، تیری جان کی قسم۔ میں نے پہلے لڑکے کا اسم تاریخی نظم کر دیا تھا اور وہ لڑکا نہ جیا۔ مجھ کو اس وہم نے گھیرا ہے کہ میری نحوست طالع کی تاثیر سے میرا ممدوح جیتا نہیں۔ نصیر الدین حیدر اور امجد علی شاہ دو والیان اودھ ایک ایک قصیدے میں چل دیے۔ واجد علی شاہ تین قصیدوں کے متحمل ہوئے پھر سنبھل نہ سکے۔ جس کی مدح میں دس بیس قصیدے کہے۔ وہ عدم سے بھی پرے پہنچا۔ صاحب، ہائی خدا کی، میں نہ تاریخ ولادت کہوں گا نہ تاریخی نام ڈھونڈوں گا۔ حق تعالی تم کو اور تمہاری اولاد کو سلامت رکھے اور عمر و دولت و اقبال عطا کرے۔"

تاریخی پرواز

میرزا کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ بعض اوقات حرف مطلب کو تاریخی پرواز دے کر بے حد پر تاثیر بنا دیتے ہیں۔ مثلاً:

۱۔ نواب علاؤالدین خاں علائی بہ زمانہ ولی عہدی لوہارو میں تھے اور اپنے

والد کے اذن و اجازت کے بغیر دہلی نہیں آسکتے تھے۔ سخت پریشان تھے۔ اس لیے کہ لوہارو میں دہلی کی رنگین اور دل آویز صحبتیں میسر نہیں آسکتی تھیں۔

میرزا لکھتے ہیں:

''تمہارے حال میں غور کی اور چاہا کہ اس کی نظیر بہم پہنچاؤں۔ واقعہ کربلا سے نسبت نہیں دے سکتا۔

لیکن اللہ تمہارا حال اس ریگستان میں بعینہ ایسا ہے جیسے مسلم بن عقیل کا حال کوفہ میں تھا۔''

اس تاریخی پرواز نے علائی کی مصیبتوں کا جو نقشہ پیش کر دیا۔ اسے کوئی تفصیل زیادہ جامع اور پرتاثیر نہیں بنا سکتی۔

۲۔ اس طرح ایک خط لکھتے ہیں۔

''تمہارے دستخطی خط نے میرے ساتھ وہ کیا جو پیراہن نے یعقوبؑ کے ساتھ کیا

۳۔ علاؤالدین خاں علائی کے نام:

''کل تمہارے خط میں دوبارہ یہ کلمہ مرقوم دیکھا کہ دہلی بڑا شہر ہے ہر قسم کے آدمی وہاں ہونگے۔ اے میری جان یہ وہ دلی نہیں جس میں تم پیدا ہوئے۔ وہ دلی نہیں جسمیں تم نے علم حاصل کیا۔ وہ دلی نہیں جسمیں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آیا کرتے تھے۔ وہ دلی نہیں جسمیں ایک دن برس سے مقیم ہوں۔

ایک کیمپ ہے۔ مسلمان اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ، باقی سراسر

ہنوز“

دیکھیے کس طرح دلی کی عظمت کے معروف ادوار کی نفی کر کے حقیقت حال نہایت موثر انداز میں مکتوب الیہ پر واضح کر دی۔ نفی کے بعد اثباتی پہلو پیش کیے وہ بھی احسن طریق پر موضع مدعا ہوئے۔ کیمپ عرف عام میں فوجیوں کی قیام گاہ یا چھاؤنی کو کہتے ہیں۔ دلی اس زمانے نے یقیناً کیمپ تھا۔ مسلمانوں کی عظمت و عزت دلی کی خصوصیت تھی۔ وہ جاتی رہی۔ مسلمان امرا مٹ گئے۔ باقی صرف اہل حرفہ رہ گئے چپراسی جمعدار خانسامے وغیرہ۔

مزاح وظرافت

میرزا کے مزاج میں شوخی اور ظرافت اس درجہ تھی کہ خواجہ حالی نے فرمایا: انھیں بجائے حیوان ناطق کے حیوان ظریف کہنا بجا ہے یہ شوخی اور ظرافت خطوں میں بھی جا بجا موجود ہے۔ مثلاً

ا۔ بعض مقامات پر محض نقالی میں صاف نہیں ہوتی۔ میرزا نے اپنے خط میں حسین علی خاں کا ذکر کیا تو ساتھ ہی لکھا:

”وہ حسین علی خاں جس کا روزمرہ ہے۔ کھلونے منگا دو۔ میں بھی جا بجا بازار جاؤنگا۔

۲۔ انکی ایک ملازمہ تھی بی وفادار جسے بیگم غالب نے وفادار بیگ خطاب دے دیا تھا۔میرزا غالب نے ایک خط میں اس کے عادات کا نقشہ کھینچا ہے۔

''باہر نکلتی ہیں۔سودا تو کیالائیں گی۔مگر خلیق اور ملنسار ہیں۔رستہ چلتوں سے باتیں کرتی پھرتی ہیں۔جب وہ محل سے نکلیں گی تو ممکن نہیں کہ اطراف نہر کی سیر نہ کریں۔ممکن نہیں دروازے کے سپاہیوں سے باتیں نہ کریں،ممکن نہیں کہ پھول نہ توڑیں اور بی بی کو لے جا کر نہ دکھائیں اور نہ کہیں کہ یہ پھول تمہارے چچا کے بیٹے کی کیائی کے ہیں۔تمہارے چچا کے بیٹے کی کیاری کے ہیں)مراد ہے امین الدین احمد خاں والی لوہارو جو بیگم غالب کے چچیرے بھائی تھے۔

۳۔ بعض اوقات موقعے اور موضوع کی مناسبت کو پیش نظر رکھتے ہوئے موزوں نام تراش لیتے ہیں۔جو بیحد مزا دیتے ہیں اور باوجود بے معنی ہونے کے میرزا کے مطلب کو بھی ٹھیک ادا کرتے ہیں مثلاً فارسی کے ایک قطعہ میں اپنے متعلق کہتے ہیں:

چوں نہ من ساقیم نہ محتسبم
نہ بہ ریزم نہ مے بہ کاس کنم
نہ بہ واجب زسعی و امانم
نہ بہ ہر مدعا مکاس کنم
بر مدارا اگر مدار نہم
کاخ الفت قومی اساس کنم

لیک نابد ذہن کہ ور گفتار

مدحت لالہ سورداس کنم

''لالہ سورداس کے نام سے دماغ میں جیسی شخصیت کا تصور ابھر سکتا ہے اس کی تفصیل میں دفتر سیاہ کر دیجیے لیکن یہ نام جن خصوصیتوں کا حامل ہے۔ان کی پوری تصویر کبھی نہ اتر سکے گی۔اور وہ اس میں وہ لطف پیدا ہوگا۔ جو ان تینوں لفظوں کی موجودہ ترتیب میں ہے۔

۴۔ اسی طرح انوالدولہ شفق کو لکھتے ہیں۔

''ڈاک کا ہرکارہ حویلی ماراں کے خطوط پہنچاتا ہے۔ان دنوں میں ایک بنیا، پڑھا لکھا حرف شناس کوئی فلاں ناتھ ڈھمک داس ہے۔

ہرکارے کی حرف شناسی کی جو تصویر، فلاں ناتھ، ڈھمک داس میں کھینچ دی گئی ہے وہ کسی توضیح کی محتاج نہیں۔

۵۔ جب انھیں کوئی دل چسپ واقعہ مل جاتا تھا تو اپنے خاص اندازمیں بیان کر کے اسے بے حد پر لطف بنا دیتے تھے مثلاً جس ہرکارے کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔اس کے متعلق لکھتے ہیں۔

''میں بالا خانے پر رہتا ہوں۔حویلی میں آ کر اس نے داروغے کو خط دے کر مجھ سے کہا کہ ڈاک کا ہرکارہ بندگی عرض کرتا ہے اور کہتا ہے کہ مبارک ہو آپ کو جیسا کہ دلی کے بادشاہ نے نوابی کا خطاب دیا تھا۔اب کالپی سے خطاب کپتانی کا ملا جیران، کہ کیا بکتا ہے۔سرنامے کو غور سے دیکھا۔کہیں قبل از اسم ''مخدوم نیاز کیشاں'' لکھا تھا۔اس قرمساق نے اور الفاظ سے قطع

نظر کر کے۔ کیشاں کو کپتان پڑھا۔"

۲۔ بعض اوقات اپنی مصیبتوں اور پریشانیوں کا نقشہ اس انداز میں کھینچتے ہیں کہ پڑھتے ہی بے اختیار ہنسی آ جاتی ہے۔ مثلاً قربان علی بیگ سالک کو لکھتے ہیں۔

"آپ اپنا تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کیا ہے جو دکھ مجھے پہنچتا ہے۔ کہتا ہوں کہ لو غالب کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی دان ہوں۔ آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب تو قرضداروں کو جواب دے۔ سچ تو یوں ہے کہ غالب کیا میرا بڑا کافر مرا۔ ہم نے ازراہ تعظیم، جیسا بادشاہوں کو مرنے کے بعد جنت آرامگاہ، عرش نشیمن خطاب دیتے ہیں۔ چونکہ یہ اپنے آپ کو شہنشاہ قلم و سخن جانتا تھا۔ سقر مقر اور زاویہ ہاویہ خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ آیئے نجم الدولہ بہادر ایک قرضدار کا گریبان میں ہاتھ۔ ایک قرضدار بھوگ سنا رہا ہے۔ میں ان سے پوچھ رہا ہوں: اجی حضرت نواب صاحب، نواب صاحب کیسے اوغلان صاحب آپ سلجوقی و افراسیابی ہیں۔ یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے کچھ تو بولو، کچھ تو اکسو، بولے کیا، بے حیا، بے غیرت، کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام قرض لیے جاتا تھا۔ یہ بھی تو سوچا ہوتا کہ کہاں سے دوں گا؟"

مقفی عبارتیں

میرزا کے زمانے میں عالمانہ انداز بیان کی ایک نمایاں خصوصیت یہ سمجھی جاتی تھی کہ پوری عبارت مقفّٰی چنانچہ خود میرزا نے بھی تقریظوں اور دیباچوں میں یہ ڈھنگ اختیار کیا ہے اور اہل ذوق کی خدمت میں یہ عرض کرنے کی ضروت نہیں کہ تقریظیں اور دیباچے کتنے ہی عالمانہ ہوں تاہم انھیں میرزا کے معروف انداز نگارش سے کوئی مناسبت نہیں۔ خطوط میں بھی میرزا نے کہیں کہیں مقفّی عبارت لکھی ہے۔ لیکن اس طرح نہیں کہ فقروں کے خواتیم میں قافیے کا التزام کرلیا بلکہ بے تکلف لکھتے لکھتے خود بخود قافیے پیدا ہو گئے۔ وہ اتنے خوشنما معلوم ہوتے ہیں گویا سونے کی انگوٹھی میں بیش قیمت ہیرجڑ دیے ہیں۔ مثلاً:

۱۔ منشی شیونرائن آرام نے اکبرآباد سے لکھا کہ اخبار کے کچھ خریدار بنانے کی سعی فرمائیے۔ جواب میں لکھتے ہیں:

''یہاں آدمی کہاں ہے کہ اخبار کا خریدار ہو، مہاجن لوگ جو یہاں بستے ہیں۔ یہ ڈھونڈتے ہیں کہ گیہوں کہاں سستے ہے بہت سخی ہوں گے جنس پوری تول دیں گے۔ کاغذ روپے مہنے کا کیوں مول لیں گے۔

۲۔ میر مہدی مجروح کے نام:

''او میاں سیدزادہ آزادہ دلی کے عاشق دلدادہ، ڈھے ہوئے اردو بازار کے رہنے والے، حسد سے لکھنو کو برا کہنے والے۔ نہ دل میں مہر و آزرم نہ آنکھوں میں حیا و شرم، نظام الدین ممنون کہاں ذوق کہاں؟ مومن کہاں ایک آزردہ۔ سو خاموش دوسرا غالب وہ بے خود مد ہوش۔ نہ سخنوری رہی۔ نہ سخن دانی کس برتے پرتا پانی۔ ہائے دلی! وائے دلی۔ بھاڑ میں جائے دلی۔

۳۔ مجروح کے نام:

''بھائی اردو کے میرزا قتیل بن گئے اردو بازار میں نہر کے کنارے رہتے رہتے ردونیل بن گئے کیسا قتیل کیسا رودنیل۔ یہ سب ہنسی کی باتیں ہیں، لو سنو اب تمہاری دلی کی باتیں ہیں۔''

کمال حسن تحریر

یہ میرزا کے اسلوب نگارش کے چند نمایاں پہلو تھے۔ انھوں نے مکاتیب کے مختصر سے مجموعے میں جو تحریری کمالات دکھائے ان کی مثالیں بہت زیادہ ہیں۔ اس بارے میں خاص طور پر قابل ذکر و توجہ امر یہ ہے کہ ان کی تحریر میں سے ایک لفظ کو آگے پیچھے کرنے یا بدلنے یا حشو و زوائد قرار دینے کی گنجائش نہیں نکل سکتی۔ جو کچھ لفظوں میں اور جس ترتیب سے بیان کر گئے ہیں اس مضمون کے لیے اس سے بہتر الفاظ اور پیرایہ بیان اختیار کرنا ناممکن نہیں، مثلاً:

۱۔ میرزا غدر کے بعد شدید مصیبتوں میں مبتلا تھے۔ صاحب عالم مارہروی نے لکھا کہ والی حیدر آباد کے لیے قصیدہ کہیے تو اسے ایک متوسل کے ذریعے سے پیش کر دیا جائے گا جواب میں لکھتے ہیں:

''میں پانچ برس کا تھا کہ میرا باپ مرا، نو برس کا تھا کہ چچا مرا، اس کی جاگیر کے عوض میرے اور میرے شرکاء حقیقی کے واسطے شامل جاگیر نواب احمد بخش خاں دس ہزار روپے سال مقرر ہوئے۔ انہوں نے نہ دیے مگر تین ہزار روپے سالا۔ اس میں خاص میری ذات کا حصہ ساڑھے سات سو روپے

سال، میں نے سرکار انگریزی میں یہ غبن ظاہر کیا۔ کول بروک صاحب ریذیڈنٹ دہلی اور اسٹرلنگ صاحب بہادر سکوٹر گورنمنٹ کلکتہ متفق ہوئے میر احق دلانے پر ریذیڈنٹ معزول ہوئے۔ سکرٹر گورنمنٹ بہ مرگ ناگاہ مر گئے۔ بعد ایک زمانے کے پادشاہ دہلی نے ۵۰ روپے مہینا مقرر کیا۔ انکے ولی عہد نے چار سو روپے سال۔ ولی عہد اس تقرر کے دو برس بعد مر گئے۔ واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کی سرکار سے بہ صلہ مدح گستری پانسو روپے سال مقرر ہوئے۔ وہ بھی دو برس سے زیادہ نہ جیے یعنی اگر چہ اب تک جیتے ہیں۔ مگر سلطنت جاتی رہی اور تباہی سلطنت دو ہی برس میں ہوئی۔ دلی کی سلطنت کچھ سخت جان تھی۔ سات برس مجھ کو روٹی دے کر بگڑی۔ ایسے طالع مربی کش اور محسن سوز کہاں پیدا ہوتے ہیں، اب میں جو والی دکن کی طرف رجوع کروں یاد رہے کہ متوسط یا مر جائے گا یا معزول ہو جائے گا اور اگر یہ دونوں امر واقع نہ ہوئے تو کوشش اس کی ضائع ہو جائے گی اور والی شہر مجھ کو کچھ نہ دے گا اور اگر احیاتا اس نے سلوک کیا تو ریاست خاک میں مل جائے گی اور ملک میں گدھے کے ہل پھر جائیں گے۔ اے خداوند بندہ پرور! یہ سب باتیں وقوعی اور واقعی ہیں۔''

۲۔ میر مجروح کے نام:

''بھائی کیا پوچھتے ہو۔ کیا لکھوں دلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر ہے۔ قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز مجمع بازار مسجد جامع کا، ہر ہفتے سیر جمنا کے پل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں۔ پھر کہو دلی کہاں؟

ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا۔‘‘

پھر گورنر جنرل کے دربار کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ پہلے دربار میں سات جاگیردار تھے کہ ان کا دربار الگ الگ تھا۔

’’چار معدوم محض ہیں۔ جو باقی رہے ان میں سے دوجا، اور لوہارو تخت حکومت بانی حصار، پاٹودی حاضر۔ اگر بانی حصار کے صاحب کمشنر بہادر ان دونوں کو یہاں لے آئے تو تین رئیس ورنہ ایک رئیس۔

دربار عام والے مہاجن لوگ سب موجود۔ اہل اسلام میں صرف تین آدمی باقی ہے میرٹھ میں مصطفیٰ خاں، سلطان جی میں مولوی صدرالدین خاں۔ بلی ماروں میں سگ دنیا موسوم بہ اسد تینوں مردود، مطرود، محروم، مغموم:

توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا
آسمان سے بادہ گلفام گو برسا کرے

۳۔ رام پور پہنچ کر لکھتے ہیں:

’’غذا میرے بھی خلاف طبع نہیں۔ پانی کا شکر کس منہ سے ادا کروں؟ ایک دریا ہے کوسی، سبحان اللہ اتنا میٹھا پانی کہ پینے والا گمان کرے کہ یہ پھیکا شربت ہے صاف، سبک گوارا سریع النفوذ۔‘‘

پانی کی مٹھاس کے لیے پھیکے شربت کی تعبیر کتنی عمدہ اور دل نشین ہے۔ دو لفظوں میں اس سے بہت تعبیر کے ہوسکتی ہے جو مٹھاس کے متعلق تاثر کی ٹھیک ٹھیک آئینہ دار بن سکے؟

۴۔ خواجہ غلام غوث بیخبر کے نام:

''آپ جانتے ہیں کہ مال یا اس مقتضی استغنا ہے بس اب اس سے زیادہ یاس کے اہو گی کہ امید مرگ جیتا ہوں۔ اس راہ سے کچھ مستی ہو چلا ہوں۔ وہ ڈھائی برس کی زندگی اور ہے۔ ہر طرح گزر جائے گی۔ جانتا ہوں کہ تم کو ہنسی آیب گی کہ یہ بکتا ہے۔ مرنے کا زمانہ کون بتا سکتا ہے؟ چاہے الہام سمجھے چاہے اوہام سمجھے۔ بیس برس سے یہ قطعہ لکھ رکھا ہے:

من	کہ	باشم	کہ	جاوداں باشم
چوں	نظیری	نہ	ماندو	طالب مرد
در	بہ	پرسند	در	کدا میں سال
مرد	غالب	بگولہ	غالب	مرد''

اب بارہ سو چھتر ہیں اور غالب مرد کے بارہ سو ستتر ہیں۔ اس عرصے میں جو کچھ مسرت پہنچی ہو پہنچ لے۔ ''ورنہ پھر ہم کہاں؟''

۵۔ انوالدولہ شفق کے نام:

''سال گزشتہ مجھ پر بہت سخت گزرا۔ بارہ تیرہ مہینے صاحب فراموش رہا۔ اٹھنا بیٹھنا دشوار تھا۔ چلنا پھرنا کیسا، تپ نہ کھانسی۔ نہ اسہال نہ فالج نہ لقوہ، ان سب سے بدتر ایک ایک صورت پر کدورت یعنی احتراق کا مرض، مختصر یہ کہ سر سے پاؤں تک بارہ پھوڑے، ہر پھوڑے پر ایک، زخم، ہر زخم ایک غار، ہر روز بارہ تیرہ پھاہے اور پاؤ بھر مرہم درکار۔ نو دس مہینے سے بے خورد خواب رہا ہوں۔ اور شب و روز بے تاب، راتیں یوں گزری ہیں کہ

اگر کبھی آنکھ لگ گئی۔ وہ گھڑی غافل رہا ہوں گا کہ ایک آدھ پھوڑے میں ٹیس اٹھی۔ جاگ اٹھا تڑپا گیا۔ پھر سو گیا پھر وہشیار ہو گیا۔ سال بھر میں تین حصے یوں گزرے۔ پھر تخفیف ہونے لگی۔ دو تین مہینے میں لوٹ پوٹ کر اچھا ہو گیا۔ نئے سرے سے روح قالب میں آئی۔ اجل نے میری سخت جانی کی قسم کھائی۔ اب اگرچہ تندرست ہوں۔ ناتوان وسست ہوں۔ حواس کھو بیٹھا۔ حافظہ کور دبیٹھا۔ اگر اٹھتا ہوں تو اتنی دیر میں اٹھتا ہون کہ جتنی دیر میں قد آدم دیوار اٹھے۔ آپ کی پرسش کے کیوں نہ قربان جاؤں کہ جب تک میرا مرنا نہ سنا۔ میری خبر نہ لی۔ میری مرگ کے مخبر کی تقریر اور یہ میری تحریر۔ آدھی سچ اور آدھی جھوٹ، درصورت مرگ نیم مردہ اور رور حالت حیات نیم زندہ ہوں۔ “

۶۔ امین الدین احمد خاں والی لوہارو نے بلایا۔ میرزا ضعف کے باعث جا نہیں سکتے تھے:

”واللہ نہیں آسکتا۔ باللہ نہیں آسکتا۔ دل کی جگہ میرے پہلو میں پتھر بھی تو نہیں۔ دوست نہ سہی۔ دشمن بھی تو نہ ہوں گا۔ محبت نہ سہی۔ عداوت بھی تو نہ ہو گی۔ آج تم دونوں بھائی (امین الدین خاں اور ضیاء الدین خاں) اس خاندان میں شرف الدولہ اور فخر الدولہ ہو۔ میں لم یلد ولم یولد ہوں۔ میری زوجہ تمہاری بہن، میرے بچے تمہارے بچے ہیں۔ خود جو میری بھتیجی ہے اس کی اولاد بھی تمہاری اولاد ہے۔ نہ تمہارے واسطے بلکہ ان بیکسوں کے واسطے تمہارا دعا گو ہوں اور تمہاری سلامتی چاہتا ہوں۔ تمنا یہ ہے اور ان شاء اللہ تعالیٰ ایسا ہی ہو گا کہ ہم تم جیتے رہو اور میں تم دونوں کے سامنے مر جاؤں تا کہ اس

قافلے کو اگر روٹی نہ دو گے تو چنے تو دو گے۔ اگر چنے بھی نہ دو گے اور بات نہ پوچھو گے تو میری بلا سے میں تو موافق اپنے تصور کے مرتے وقت ان فلک زدوں کے غم میں نہ الجھوں گا۔"

۷۔ علاؤالدین احمد خاں علائی کے نام:

"اگر چہ یک فنہ ہوں۔ مگر مجھے اپنے ایمان کی قسم۔ میں نے اپنی نظم ونثر کی داد بہ اندازہ بایست پائی نہیں۔ آپ ہی کہا اور آپ ہی سمجھا۔ قلندری و آزادگی و ایثار و کرم کے جو دواعی میرے خالق نے مجھ میں بھر دیئے۔ ان میں سے بقدر رزار، یک ظہور میں نہ آئے۔ نہ وہ طاقت جسمانی کہ لاٹھی ہاتھ میں لوں اور اس میں شطرنج اور ٹین کا ایک لوٹا مع سوت کی ایک رسی کے لٹکا لوں اور پیادہ پا چل دوں۔ کبھی شیراز جا نکلا۔ کبھی مصر میں جا ٹھہرا۔ کبھی نجف جا پہنچا۔ نہ وہ دستگاہ کہ ایک عالم کا میزبان جاؤں۔ اگر تمام عالم میں نہ ہی۔ جس شہر میں رہوں۔ اس میں بھوکا ننگا نظر نہ آئے۔ خدا کا مقہور، خلق کا مردود۔ بوڑھا، ناتواں بیمار فقیر، نکبت میں گرفتار۔"

۸۔ امین الدین احمد خاں نے حاجی جان محمد قدسی کی ایک غزل پر غزل کہنے کی فرمائش کی۔ علائی کو لکھتے ہیں:

"بھائی۔ تمہارا باپ بدگمان ہے مجھ کو زندہ سمجھتا ہے۔ میرا اسلام کہو اور میرا یہ شعر پڑھ کر سناؤ:

گمان زیست بود بر منت ز بے دردی
بداست مرگ ولے بد تراز گمان تو نیست

مجھے کافور و کفن کی فکر پڑ رہی ہے اور وہ ستم گر شعر و سخن کا طالب ہے۔''

۹۔ علائی نے مکان کا پتا باصرار پوچھا۔ جواب میں لکھتے ہیں:

''قسم شرعی کھا کر کہتا ہوں کہ ایک شخص ہے کہ اس کی عزت اور نام آوری جمہور کے نزدیک ثابت اور محقق ہے اور صاحب تم بھی جانتے ہو۔ مگر جب اس سے قطع نظر نہ کرو اور اس مسخرے کو گمنام اور ذلیل نہ سمجھ لو، تم کو چین نہ آئے گا۔ پچاس برس سے دلی میں رہتا ہوں۔ ہزار ہا خط اطراف و جوانب سے آتے ہیں۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ محلّہ نہیں لکھتے۔ بہت لوگ ایسے ہیں کہ محلّہ سابق کا نام لکھ دیتے ہیں۔ حکام کے خطوط فارسی اور انگریزی یہاں تک کے آئے ہوئے صرف شہر کا نام اور میرا نام یہ سب مراتب تم جانتے ہو اور ان خطوط کو دیکھ چکے ہو اور پھر مجھ سے پوچھتے کہ اپنا مسکن بتا۔ اگر میں تمہارے نزدیک امیر نہیں نہ سہی۔ اہل حرفہ میں سے بھی نہیں ہوں کہ جب تک محلّہ اور تھانہ نہ لکھا جائے۔ ہرکارہ پتا نہ پائے۔

تعزیتی خطوط

میرزا کے کمال تحریر کا ایک نمونہ تعزیتی خطوط میں دیکھا جا سکتا ہے۔ امین الدین احمد خاں کل والی لوہارو کی والدہ فوت ہو گئیں۔ انھیں لکھتے ہیں:

''بھائی صاحب۔ آج تک سوچتا رہا کہ بیگم صاحب قبلہ کے انتقال کے باب میں تم کو کیا لکھوں؟ تعزیت کے واسطے تین باتیں ہیں: اظہار غم، تلقین صبر، دعائے مغفرت، سو بھائی اظہار غم تکلف محض ہے۔ جو غم تم کو ہوا۔ ممکن

نہیں دوسرے کو ہوا ہو تلقین صبر بیدردی ہے۔ یہ سانحہ عظیم ایسا ہے جس نے غم رحلت نواب مغفور، احمد بخش خاں کو تازہ کر دیا۔ پس ایسے موقع پر صبر کی تلقین کیا کی جائے۔ رہی مغفرت، میں کیا اور میری دعا کیا؟ مگر چونکہ وہ میری مربیہ اور محسنہ تھیں دل سے دعا نکلتی ہے۔

یوسف میرزا کے والد کی وفات پر:

''یوسف میرزا کیونکر تجھ کو لکھوں کہ تیرا باپ مر گیا اور اگر لکھوں بھی تو آگے کیا لکھوں کہ اب کیا کرو۔ مگر صبر؟ یہ ایک شیوہ فرسودہ ابنا روزگار ہے۔ تعزیت یوں ہی کیا کرتے ہیں اور یہی کہا کرتے ہیں کہ صبر کرو۔ ہائے ایک کا کلیجہ کٹ گیا اور لوگ اسے کہتے ہیں کہ تو نہ تڑپ۔ بھلا کیونکر نہ تڑپے گا۔ اصلاح اس میں نہیں بتائی جاتی۔ دعا کو دخل نہیں دوا کا لگاؤ نہیں۔ پہلے بیٹا مرا۔ پھر باپ مرا مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ بے سروپا کس کو کہتے ہیں۔ تو میں کہوں گا یوسف میرزا کو تمہاری دادی لکھتی ہیں رہائی کا حکم ہو چکا تھا۔ یعنی قید فرنگ سے بعد غدر یہ بات سچ ہے۔ اگر سچ ہے تو جوانمرد ایک بار دونوں قیدوں سے چھوٹ گیا ب۔ نہ قید حیات رہی۔ نہ قید فرنگ۔''

نواب یوسف علی خاں فرمانروائے رام پور کے نام ان کی والدہ کی وفات پر:

''نواب میرزا (داغ دہلوی) نے دلی آ کر پہلے نوید بزم آرائی سنائی۔ چاہتا تھا کہ اس کی تہنیت لکھوں۔ کل اس نے از روئے خط آمدہ رام پور حضرت جناب عالیہ کے انتقال کی خبر سنائی۔ کیا کہوں، کیا غم واندوہ کا ہجوم ہوا۔ حضرت کے غمگین ہونے کا تصور کر کے اور مغموم ہوا۔ بے درد نہیں ہوں کہ

ایسے مقام میں بہ طریق انشاء پردازی عبارت آرائی کروں۔ نادان نہیں ہوں کہ آپ جیسے دانا دل دیدہ ور کو تلقین صبر و شکیبائی کروں۔''

از دست گدائے بے نوا نا ید ہیچ
جز آں کہ بہ صدق دل دعائے بہ کند''

میرزا کی شخصیت خطوط کے آئینے میں

میں نے میرزا کے اسلوب نگارش کی بعض نمایاں خصوصیات واضح کر دیں اور اس امر کی طرف شروع میں اشارہ کر چکا ہوں کہ ان چند سو خطوں میں میرزا نے اپنی شخصیت کے مختلف پہلو اس تفصیل سے واضح کر دیے ہیں کہ تنہا انھیں کو سامنے رکھ کر اس کی زندگی کا جامع اور مکمل نقشہ تیار کیا جا سکتا ہے۔ یہاں تک کہ ان کے اوضاع و اطوار اور اخلاق و عادات کا پہلو بھی اس سے باہر نہ رہے گا۔ بے شائبہ مبالغہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ خطوط محض اس وجہ سے بیش بہا نہیں کہ غالب کے خطوط ہیں، بلکہ انکی بیش بہائی کے دوسرے وجود بھی ہیں مثلاً:

۱۔ ان کے آئینے میں غالب کی شخصیت ایسے رنگ میں جلوہ گر نظر آتی ہے۔ کہ اکثر اصحاب کی زندگی میں بھی سے اس تفصیل سے دیکھنے کا موقع شاید ہی ملا ہو۔

۲۔ یہ خطوط اردو زبان میں گونا گوں اسالیب بیان کا ایک نہایت نادر اور دلکش مرقع ہے۔

۳۔ ان میں غالب کے سوانح حیات کا زیادہ سے زیادہ سرمایہ موجود ہے۔

۴۔ ان میں غالب کے دل و دماغ کی مکمل تصویر خود انکے موقلم سے تیار ہو کر سامنے آ گئی ہے۔ اور یہ تصویر اس جامعیت سے نہ ان کے کلیات نظم فارسی میں ملتی ہے۔ نہ کلیات نثر فارسی میں اور نہ اردو دیوان میں، جو ہمارے ہاں ان کی یگانہ شہرت کا شہپر پرواز ہے۔

غالب سے پہلے بھی بعض اکابر علم و فضل کے مکاتیب ترتیب پا کر شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے بعد مشاہیر ادب اردو کے خطوط و عقیدت مندوں نے مرتب کر کے چھاپ دیے لیکن اس حقیقت کے اعتراف میں غالباً کسی صاحب علم و نظر کو قطعاً تامل نہ ہوگا کہ غالب نے اپنی سرسری تحریرات میں ذات و ماحول کے متعلق معلومات کا جو گراں قدر ذخیرہ بےقصد و ارادہ فراہم کر دیا ہے۔ اس کا عشر عشیر بھی کسی دوسرے مجموعے میں نظر نہ آئے گا اور اسلوب فکر و نگارش میں ابداع کی جو فراوانی غالب کے ہاں موجود ہے۔ اسکی مثالیں تو شاید ہی مل سکیں، گویا مکاتیب نگاری کے دائرے میں بھی غالب کی انفرادیت و یکتائی محتاج شرح و بیان نہیں۔ کاش ان مکاتیب پر پوری توجہ فرمائی جائے اور غالب کے فارسی کلام کی طرح یہ شکوہ سنج بے اعتنائی نہ رہیں

مہر

مسلم ٹاؤن۔ لاہور

۱۴ مئی ۱۹۵۱ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"خطوط غالب کا یہ چوتھا ایڈیشن ہے۔ اس میں ان خطوط کی بھی خاصی بڑی تعداد کردی گئی ہے جو پہلے ایڈیشنوں کے وقت دستیاب نہیں ہوسکے تھے۔ تصحیح اور ترتیب وتحشیہ کے اہتمام میں بھی حتیٰ الامکان کوئی دقیقہ سعی اٹھا نہیں رکھا گیا۔ لہذا اگر میں گزارش کروں کہ اب کتاب سابقہ ایڈیشنوں کے مقابلہ زیادہ مکمل و جامع ہے تو شاید وہ ستایش نفس پر محمول نہ ہو بعض خطوط بروقت ہاتھ نہ آسکے اور تکمیل کتابت کے بعد ملے لہذا انھیں مجبوراً ضمیمہ میں درج کیا گیا۔

مجھ ظلوم وجہول کے کمزور کندھوں پر مختلف انواع علی کاموں کا جو بار گراں اتفاقات کی بنا پر آپڑا ہے وہ ایسا نہیں کہ سالہا سال پیشتر کی مرتبہ وہ مطبوعہ کتاب کے سلسلے میں مزید جمع وفراہمی مواد کے لیے تگ و دو کا فرض بہ طریق احسن انجام دے سکتا۔ یا تصحیح کی ذمہ داریاں سے بقدر واجب عہدہ برآ ہوسکتا۔ خدائے بزرگ و برتر کی رحمت سے مجھے اپنے عزیز دوست اور خوش ذوق رفیق محمد عالم مختار حق صاحب کی اعانت میسر آ گئی جن کی مساعی جمیلہ سے یہ کٹھن مسافت میرے لیے ہمہ وجوہ آسان ہوگئی۔ ان کی پر اخلاق محبانہ اعانت کا حق سپاس الفاظ میں ادا نہیں سکتا۔ یہی کہہ سکتا ہوں کہ اللہ تعالٰی انھیں جزا دے اور مجھ عاجز کو ان کی اس لٰلہی یاوری کے احسان سے سبکدوش ہونے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین

مسلم ٹاؤن

۳۔ مارچ ۱۹۶۸ء۔۔۔ مہر

خاندان لوہارو

خاندان لوہارو کے حالات مختصراً یہ ہیں:

اٹھارھویں صدی کے وسط میں سمرقند سے تین بھائی پنجاب آئے۔ قاسم جان، عالم جان اور عارف جان، قاسم جان سب سے بڑے تھے۔ نواب معین الملک عرف میر منو ناظم پنجاب نے بڑی قدر و منزلت کی اس لیے کہ میر منو کے اجداد بھی تورانی تھے۔ چنانچہ ان بھائیوں نے کچھ مدت لاہور میں میر منو کے پاس گزاری۔ اس کی وفات پر نظامت پنجاب کا کارخانہ درہم برہم ہوتا نظر آیا تو قاسم جان اپنے بھائیوں اور رفیقوں کو لے کر پنجاب سے آگے بڑھ گئے تاکہ کسی دوسری جگہ قسمت آزمائیں۔ اس زمانے میں شہزادہ عالی گوہر کہ جو بعد میں شاہ عالم ثانی کے لقب سے بادشاہ بنا، بہار میں تجربہ کار اور باتدبیر آدمیوں کی ضرورت تھی۔ قاسم جان بہار کی طرف روانہ ہوگئے۔ شہزادے کے پاس پہنچنے سے پہلے میر جعفر ناظم بنگال کے بیٹے میر صادق عرف میرن کا ایک قافلہ مل گیا۔ جو شہزادے کی مخالف فوج کے لیے سامان رسد لیے جا رہا تھا۔ قاسم جان نے اس پر حملہ کرکے سارا سامان چھین لیا۔ شہزادے نے اس خدمت پر خوش ہوکر قاسم جان کو شرف الدولہ کا خطاب دیا اور اپنے رفقاء خاص میں داخل کرلیا۔

شہزادہ اپنے والد عزیز الدین عالمگیر ثانی کے قتل پر بادشاہ بن گیا۔ لیکن گیارہ برس اس نے پورب ہی میں گزار دیے۔ قاسم جان نے یہ مدت غالباً پورب ہی میں بسر کی۔ جب ۱۷۷۱ء میں بادشاہ دہلی آیا تو قاسم جان بھی ساتھ آئے۔ انھیں

کی وساطت سے نجف خاں ملازمت شاہی میں داخل ہوا ذوالفقار الدولہ خطاب پایا اور اپنی وفات تک ۱۷۸۲ء وہ سلطنت کا مختار عام بنا رہا۔ اس زمانے میں قاسم جان اور ان کے بھائیوں کی سکونت غالباً اسی محلّہ میں رہی جو بعد میں گلی قاسم جان کے نام سے مشہور ہوا اور اب تک اسی نام سے پکارا جاتا۔

میرا خیال ہے کہ میرزا غالب کے دادا میرزا قوقان بیگ خاں بھی قاسم جان ہی کے ساتھ ہندوستان آئے تھے اور غالبا قاسم جان کے خاندان سے ان کی قرابت بھی تھی۔ جس کا سلسلہ بعد میں بھی جاری رہا۔

ذوالفقار الدولہ نجف خاں کے انتقال پر دربار دلی کا رنگ بگڑ گیا۔ یہاں تک کہ غلام قادر خاں روہیلے کے مختصر سے دور عروج میں شاہی خاندان پر ہولناک آفتیں نازل ہوئیں۔ شاہ عالم کو اندھا کر دیا گیا اور اسے کہنا پڑا۔

چشم من کندہ شد از جور فلک بہتر شد
تا نہ بینم کہ کند غیر جہانداری ما

اس زمانے میں قاسم جان دہلی سے دل برداشتہ ہو کر لکھنو چلے گئے اور آصف الدولہ کے پاس ملازمت کر لی لکھنو ہی میں قاسم جان نے وفات پائی۔ ان کے اقربا اور متوسلین وہاں سے چلے آئے۔ غالب کے دادا نے جے پور میں ملازمت کے بعد آگرے میں سکونت اختیار کر لی۔ قاسم جان کا خاندان پہلے کیطرح دہلی میں مقیم ہو گیا۔

قاسم جان کے کتنے بیٹے تھے؟ تحقیقی طور پر معلوم نہیں۔ لیکن دو کے نام ہم جانتے ہیں، ایک شرف الدولہ فیض اللہ بیگ خاں دوسرے قدرت اللہ بیگ خاں،

فیض اللہ بیگ خاں کے بیٹے غلام حسین خاں مسرور تھے جو غالب کے ہم زلف اور زین العابدین خاں عارف کے باپ تھے ۔قدرت اللہ خان نے دو بیٹوں اور ایک بیٹی کا ہمیں علم ہے بڑے بیٹے معین الدین حسین خاں تھے ۔جنھوں نے غدر کا روزنامچہ اردو میں لکھا تھا۔تھیوفلس مٹکاف نے اسے انگریزی میں چھاپا اور خواجہ حسن نظامی نے اس کا ترجمہ اردو میں چھپوایا۔دوسرے بیٹے کا نام محمد حسین خاں تھا ۔ان دونوں کا ذکر غالب کے خطوط میں آیا ہے ۔قدرت اللہ بیگ خاں کی بیٹی نواب ضیاءالدین احمد خاں نیر کی بیگم تھی ۔

قاسم جان کے بھائی عالم جان یا اس کی اولاد کا حال معلوم نہ ہوسکا۔

تیسرے بھائی عارف جان کے چار بیٹے تھے ۔فخر الدولہ دلاور لملک نواب احمد بخش خاں ۔نواب الہی بخش خاں معروف محمد بخش خاں اور نبی بخش خاں، احمد بخش خاں آخری دور کے امراء میں ممتاز فرد تھے ۔ ذاتی قابلیت سے فیروز پور جھرکا (ضلع گوڑگانوہ) کی ریاست اور لوہارو کی جاگیر حاصل کی ۔ان کی دو بیگمیں تھیں ۔ایک میواتی الاصل (مدی عرف بہو خانم) اور دوسی ہم قوم (بیگم جان) پہلے کے بطن سے نواب شمس الدین احمد خاں تھے ۔ہم قوم کے بطن سے نواب امین الدین خاں والی لوہارو اور ضیاءالدین احمد خاں نیر، اہل خاندان شمس الدین احمد خاں کو نسلا اپنا ہم رتبہ نہیں سمجھتے تھے ۔اس وجہ سے خاندان میں مناقشت پیدا ہوئی جس نے انجام کا یہ شکل اختیار کرلی کہ شمس الدین احمد خاں ایک فریق بن گئے ۔ باقی سارے خاندان نے ان کے خلاف جتھا بنالیا۔

احمد بخش خاں نے ان مناقشات کو روکنے کی غرض سے ریاست دو حصوں

میں بانٹ دی۔علاقہ فیروز پوجھرکا شمس الدین احمد خاں کے حوالے کر دیا۔لوہارو کی جاگیر چھوٹے بیٹوں کو دیدی۔۱۸۶۲ء میں وفات پائی۔

لیکن تقسیم کے باوجود جھگڑے قائم رہے۔امین الدین اور ضیاءالدین احمد خاں نے باپ کی جائداد منقولہ میں سے اپنے حصے کا مطالبہ شروع کر دیا۔شمس الدین احمد خاں لوہارو کے دعویدار بن گئے۔یہ کشاکش کئی برس تک جاری رہی۔ آخر لوہارو امین الدین احمد خاں اور ضیاءالدین احمد خاں کو مل گیا۔یہ فیصلہ چونکہ ولیم فریزرریزیڈنٹ دہلی کی کوشش سے ہوا تھا۔اس وجہ سے شمس الدین احمد خاں اور ولیم فریزر کے درمیان عداوت پیدا ہوگئی۔۱۸۳۵ء میں فریزر مارا گیا۔اس سلسلے میں شمس الدین احمد خاں اور ان کا ایک سپاہی ماخوذ ہوئے۔ان کو پھانسی کی سزا ملی او رفیروز پورجھکا کی ریاست ضبط کر لی گئی۔شمس الدین احمد خاں کے نرینہ اولاد نہ تھی۔صرف دو لڑکیاں تھیں۔مشہور ہے کہ فصیح الملک میرزا داغ دہلوی شمس الدین احمد خاں کے صاحبزادے تھے مگر شمس الدین احمد خاں کی جائداد متروکہ کے جو دعوے وارثوں کی طرف سے ہوئے تھے ان میں داغ کا کوئی ذکر نہیں۔نواب امین الدین احمد خاں رئیس لوہارو قرار پائے۔اور ۱۸۶۹ء میں فوت ہوئے۔ان کے بڑے صاحبزادے اور وارث ریاست نواب علاؤالدین احمد خاں علائی تھے جنھیں میرزا غالب نے اپنا خلیفہ ثانی بنایا تھا۔عربی اور فارسی کے بہت بڑے عالم اور خوش ذوق شاعر تھے۔ترکی بھی بہ اچھی طرح جانتے تھے۔ترکی زبان کی ایک لغت بھی لکھی تھی۔اکتوبر ۱۸۸۴ء میں فوت ہوئے ان کے جانشین نواب سر امیرا لدین احمد خاں تھے، جو ابتداء میں فرخ میرزا کے نام سے پکارے جاتے تھے۔

بڑے خوش مذاق، علم دوست اور مجلس آرا بزرگ تھے۔ امین الدین احمد خاں۔ علاؤالدین اورامیر الدین احمد خاں تینوں کے نام غالب کے خطوط موجود ہیں۔

امین الدین احمد خان کے چھوٹے بھائی نواب ضیاءالدین احمد خاں کو منصب ریاست حاصل نہ تھا۔ البتہ حصے کی رقم ملتی تھی۔ وہ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ علم تاریخ میں اپنے عہد کے یگانہ ماہر سمجھے جاتے تھے۔ تاریخی کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ جمع کیا تھا۔ ایلیٹ نے انھیں سے نادر قلمی نسخے لیکر اپنی مشہور تاریخی انگریزی میں مرتب کی۔ وہ اردو میں نیر اور فارسی میں رخشاں تخلص کرتے تھے۔ غالب نے انہیں خلیفہ اول بنایا تھا۔ فارسی کلیات میں ایک قصیدہ انکی مدح میں ہے اس میں فرماتے ہیں۔

منم خزینہ راز و خزینہ راز
ضیائے دین محمد کہیں برادر من
بہ دین و دانش و دولت یگانہ آفاق
بہ عمر کہتر و از روے رتبہ بہتر من

عارف کے مرثیہ میں بھی ان کا ذکر آیا ہے

ہم سے تمہیں نفرت سہی نیر سے لڑائی
بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

ان کا منتخب کلام صحیفہ زریں کے نام سے چھپا تھا۔ آجکل کمیاب ہے۔ ۱۸۸۵ء میں وفات پائی۔ نیر کے دو صاحبزادے تھے۔ شہاب الدین احمد خاں ثاقب اور سعید الدین احمد خاں طالب۔ دونوں علم وفضل میں خاندانی روایات کے حامل تھے

۔ثاقب نے ۶ محرم الحرام ۱۲۸۶ھ (مطابق ۹ اپریل ۱۸۶۹ء) کو یعنی غالب سے تقریباً دو ماہ بعد بعارضہ تپ و اسہال وفات پائی اور حسب وصیت درگاہ قدم شریف میں اپنے عم محترم نواب شمس الدین احمد خاں کے پہلو میں دفن ہوئے۔قربان علی بیگ سالک نے تاریخ کہی:

از صدمہ مرگ ثاقب والا جاہ
ہر سوست صدائے نالہ ہائے جانکاہ
تاریخ وفات اوچنیں سالک گفت
روز ششم ماہ محرم صد آہ

ان کے چار بیٹے تھے۔ممتاز الدین احمد خاں شجاع الدین احمد خاں تاباں۔ سراج الدین احمد خاں اور بہاؤالدین احمد خاں۔تاباں اور سائل بوڑھے ہو کر فوت ہوئے۔ بہاؤالدین احمد خاں کا انتقال جوانی ہی میں فوت ہو گیا تھا۔ انکی صرف ایک صاحبزادی تھی۔جس کی شادی نواب سر ذوالفقار علی خاں مرحوم رئیس مالیر کوٹلہ سے ہوئی۔وہ خدا کے فضل سے زندہ ہیں۔تاباں کے کوئی اولاد نہ تھی۔نواب سعید الدین احمد خاں طالب بھی لاولد فوت ہوئے۔

نواب الٰہی بخش خاں معروف ابتداء ہی میں مولانا فخر الدین فخر عالم کے مرید ہو گئے اور انھوں نے ساری عمر گوشہ نشینی میں گزاردی۔انکے دو بیٹوں اور دو بیٹیاں تھیں۔بیٹیوں میں سے ابادی بیگم کی شادی نواب غلام حسین خاں مسرور سے ہوئی۔زین العابدین خاں عارف کے بیٹے تھے۔امراؤ بیگم میرزا غالب سے بیاہی گئی۔اس کی اولاد بچپن ہی میں مرتی رہی۔آخر اس نے پہلے عارف کو بیٹا بنالیا۔

عارف کی وفات پر اس کے دونوں بیٹوں باقر علی خاں کامل اور حسین علی خاں شاداں کو بیٹوں کیطرح پالا۔ باقر علی خاں پہلے الور ملازم ہو گئے تھے۔ پھر ملازمت چھوڑ کر گھوڑوں کی تجارت شروع کر دی۔ یکم جمادی الاول ۱۲۹۳ھ مطابق ۲۵ مئی کو ساڑھے اٹھائیس برس کی عمر میں فوت ہوئے۔ ان کی تین بیٹیاں تھیں۔ بڑی محمد سلطان بیگم عرف جندو بیگم جن کی شادی شجاع الدین احمد خاں تاباں ل سے ہوئی۔ دوسری فاطمہ سلطان بیگم عرف بندو بیگم ان کی شادی نواب علاؤالدین احمد خاں رئیس لوہارو کے صاحبزادے مرزا بشیر الدین احمد خاں سے ہوئی۔ تیسری رقیہ بیگم کرنیل ذولنور احمد خاں سے بیاہی گئی۔

حسین علی خاں شاداں۔ غالب کے بعد ریاست رام پور میں پچیس روپے کے ملازم ہو گئے تھے۔ بڑی بھائی کی وفات کے صدمے نے دماغی توازن بگاڑ دیا اور وہ ملازمت چھوڑ کر دہلی چلے آئے۔ یکم شوال ۱۲۹۷ھ کو وفات پائی۔ انہیں وہم ہو گیا تھا کہ موٹا آدمی شاعر نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ غذائی تقلیل کے اہتمام میں آخر کار کھانا ترک کر دیا اور پانی سپلیوں میں پیتے تھے۔ اس ک طرح صحت تباہ ہو گئی۔

عارف کے علاقی بھائی حیدر حسن خاں کے بیٹے کا نام ضمیر الدین میرزا عرف خضر میرزا تھا۔ وہ تحصیدار تھے پنشن لے کر قطب صاحب میں گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ بڑی عمر پائی۔ غالب کو دیکھا تھا اور اس عہد کی دلکش باتیں سنایا کرتے تھے۔ ان کا بھی انتقال ہو چکا ہے۔ رحمہ اللہ تعالی

معروف کے بڑے بیٹے کا نام میرزا علی بخش خاں تھا اور میرزا غالب سے ان کا تعلق آخری وقت تک نہایت خوشگوار رہا۔ دوسرے بیٹے علی نواز خاں نے جوانی ہی

میں وفات پائی۔علی بخش خاں کے بیٹے کا نام غلام فخر الدین خاں تھا پہلی بیوی کی وفات کے بعد علی بخش خاں نے دوسرا نکاح میرزا غالب کی بھانجی امانی خانم سے کیا ۔انھیں فیروز پور جھرکا سے سو روپے ماہانہ ملتے تھے۔ریاست ضبط ہوئی تو وظیفہ صرف پچاس روپے رہ گیا۔وہ کچھ مدت حیدرآباد میں رہے پھر عرب سرائے دہلی میں رہنے لگے۔وہیں ۱۸۶۴ء میں فوت ہوئے۔ان کے فرزند غلام فخر الدین کی شادی غالب کی بھتیجی میرزا یوسف خاں دیوانہ کی بیٹی) عزیز النساء بیگم سے ہوئی تھی ۔یہ شاہی ملازم تھے۔غدر کے بعد ان پر مقدمہ چلا،لیکن کوئی جرم ثابت نہ ہوا و ربری ہو گئے۔ان کے بیٹے میرزا محمد سعید خاں حیدرآباد چلے گئے تھے۔پہلے ملازم رہے،پھر درویش بن گئے اور بیس بائیس برس یا دالہی میں گزار کر وہیں فوت ہوئے ۔مستعد پورہ میں دفن ہیں۔ان کے صاحبزادے میرزا نصر اللہ خاں بیرسٹرایٹ لاء سرکار آصفیہ میں صدر محاسب کونٹ جنرل بن گئے تھے نواب الہی بخش معروف کے دیوان کی پہلی جلد انہیں کی کوشش سے شائع ہوئی۔

میرزا قربان علی بیگ خاں سالک اور میرزا شمشاد علی بیگ خاں۔رضوان میرزا عالم بیگ خاں کے صاحبزادے تھے دونوں اردو کے اچھے شاعر مانے جاتے تھے۔ سالک حیدرآباد میں پیدا ہوئے ۔اور دہلی میں نشوونما پائی۔بڑے خوش مزاج شگفتہ اور ذکی آدمی تھے۔غدر کے بعد الور میں وکالت کا عہدہ پایا۔پھر حیدرآباد چلے گئے۔ جہاں ان کے چچا نواب تاڑ بن کے خانہ داماد بن گئے تھے۔محکمہ تعلیم میں سررشتہ داری کا عہدہ مل گیا۔نواب عمادالملک سید حسین بلگرامی کی سرپرستی میں ایک رسالہ ''مخزن الفوائد کے نام سے جاری کیا۔جس میں تاریخی مضامین چھپتے

تھے۔ شطرنج کھیلنے میں خاص مہارت تھی۔ حیدر آباد ہی میں ۱۲۹۱ھ، ۱۸۷۴ء میں فوت ہوئے۔ رضوان بھائی کی وفات کا صدمہ برداشت نہ کر سکے۔ ۱۲۹۳ھ، ۱۸۷۶ء میں وہ بھی چل بسے۔

اس خاندان کے جن افراد کے نام غالب کے خطوط موجود ہیں۔ ان کی فہرست مع تعداد مکاتیب ذیل میں درج ہے۔

مکتوب الیہ	تعداد مکاتیب
نواب امین الدین احمد خاں	۲
نواب علاؤ الدین احمد خاں	۵۶
نواب سر امیر الدین احمد خاں	۱
نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر	۱
شہاب الدین احمد خاں ثاقب	۹
قربان علی بیگ سالک	۲
شمشاد علی بیگ خاں رضواں	۲
باقر علی خاں کامل	۲

یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ محض اتنے ہی خطوط لکھے گئے۔ بعض خط یقیناً ضائع ہو گئے ہوں گے۔ خطوں کو محفوظ رکھنے کا اہتمام سب سے بڑھ کر علائی نے کیا تھا۔ نواب سر امیر الدین احمد خاں، غالب کی وفات کے وقت زیادہ سے زیادہ آٹھ برس کے

ہو نگے ۔ ان کے نام صرف ایک خط ہے۔ وہ خود فرماتے تھے کہ اردو ے معلیٰ چھپ رہی تھی۔ مجھ سے کہا گیا کہ ایک خط تم بھی اپنے نام لکھوالو۔ چنانچہ میں نے جا کر عرض کیا کہ دادا جان ایک خط ہمارے نام بھی لکھ دیجیے۔ اس طرح وہ لکھا گیا۔ نیر، ثاقب، سالک، رضوان اور کامل کے نام اس وجہ سے بھی خط کم ہیں کہ وہ لوگ عموماً دہلی میں رہتے تھے۔ اور روزانہ غالب سے ملتے تھے اس لیے انھیں خط لکھنے کی ضرورت نہ پڑتی تھی۔ کامل کو خط اس زمانے میں لکھے گئے۔ جب وہ الور میں ملازم ہو گئے تھے۔

نواب امین الدین احمد خاں

بھائی صاحب!

ساٹھ برس سے ہمارے تمہارے بزرگوں میں قرابتیں بہم پہنچیں۔ نج کا میرا تمہارا معاملہ یہ کہ پچاس برس سے تم کو چاہتا ہوں۔ بے اس کے کہ چاہت تمہاری طرف سے بھی ہو۔ چالیس برس سے محبت کا ظہور طرفین سے ہوا۔ میں تمہیں چاہتا رہا۔ تم مجھے چاہتے رہے۔ وہ امر عام اور یہ خاص، کیا مقتضی اس کا نہیں کہ مجھ میں تم میں حقیقی بھائیوں کا سا اخلاص پیدا ہو جائے۔ وہ قرابت اور یہ مووت کیا پیوند خون سے کم ہے؟ تمہارا یہ حال سنوں اور بے تاب نہ ہو جاؤں اور وہاں نہ آؤں؟ مگر کیا کروں۔ مبالغہ نہ سمجھو۔ میں ایک قالب بے روح ہوں:

یکے مردہ بصورت شخصم بمردی رواں

اضمحلال روح کا روز افزوں ہے۔ صبح کو تبرید، قریب دوپہر کے روٹی، شام کو شراب، اگر اس میں سے جس دن ایک چیز اپنے وقت پر نہ ملی۔ وہ اللہ نہیں آ سکتا۔ باللہ نہیں آ سکتا۔ دل کی جگہ میرے پہلو میں پتھر بھی تو نہیں۔ دوست نہ سہی۔ دشمن بھی تو نہ ہوں گا۔ محبت نہ سہی عداوت بھی تو نہ ہوگی۔ آج تم دونوں بھائی اس خاندان میں شرف الدولہ اور فخر الدولہ کی جگہ ہو۔ میں لم یلد ولم یولد ہوں۔ میری زوجہ تمہاری بہن، میرے بچے تمہارے بچے ہیں۔ خود جو میری حقیقی بھتیجی ہے، اس کی اولاد بھی تمہاری اولاد ہے۔ نہ تمہارے واسطے بلکہ ان بیکسوں کے واسطے تمہارا دعا گو ہوں اور تمہاری سلامتی چاہتا ہوں۔ تمنا یہ ہے اور ان شاء اللہ ایسا ہی ہوگا کہ تم

جیتے رہواور تم دونوں کے سامنے میں مر جاؤں تا کہ اس قافلے کو اگر روٹی نہ دو گے چنے تو دو گے اور اگر چنے بھی نہ دو گے اور بات نہ پوچھو گے تو میری بلا سے۔ میں تو موافق اپنے تصور کے مرتے وقت ان فلک زدوں کے غم میں نہ الجھوں گا۔

۱، امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں ،۲، شرف الدولہ قاسم جان کا خطاب تھا جو اس کے بیٹے فیض اللہ بیگ خاں کو ملا۔ فخر الدولہ احمد بخش کا خطاب تھا ۔۳، مطلب یہ کہ میرے کوئی اولاد نہیں ۔۴، بچوں سے مرا میرزا کے اپنے بچے بلکہ عارف کے بچے ہیں جو میرزا کی تحویل میں تھے۔ ۵، غالب کی بھتیجی یعنی میرزا یوسف خاں کی بیٹی عزیز النساء بیگم جو علی بخش خاں بن الٰہی بخش خاں معروف غالب کے خسر، کے بیٹے غلام فخر الدین سے بیاہی گئی تھی۔ گویا اس کی اولاد بھی خاندان لوہارو میں سے ہوگی۔

۶، انسان کو غم صرف زندگی تک ہوتا ہے مرنے کے بعد غم یا خوشی میں اس کے لیے بے معنی ہو جاتے ہیں۔ میرزا کا مطلب یہ ہے کہ بیوی بچوں کو تمہارے حوالے کر کے میں اطمینان سے مر جاؤں گا۔ اس لیے کہ تصور یہ بات ہوگی۔ تم ان کی کفالت کروگے۔ اگر اس فرض کو پورا نہ کروگے تو میری بلا سے، میری موت تو بحالت اطمینان ہوگی۔

جناب والدہ ماجدہ تمہاری یہاں آنا چاہتی ہیں اور ضیا الدین احمد خاں اسی واسطے وہاں پہنچتے ہیں۔ سنو بعد تبدیل آب و ہوا دو فائدے اور بھی بہت بڑے ہیں۔ کثرت اطباء، صحبت احبا، تنہائی سے نہ ملول رہو گے۔ حرف و حکایت میں

مشغول رہو گے۔ آؤ آؤ۔ شتاب آؤ بھائی۔

میرزا علاؤ الدین خاں تم کو کیا لکھوں جو وہاں تمہارے دل پر گزرتی ہو گی۔ یہاں میری نظر میں ہے۔ خیر دعائے مزید عمر و دولت   نجات کا طالب،

غالب

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

(۲)

اخ مکرم کے خدا کرام کی خدمت میں بعد ادائے سلام، مسنون ملتمس ہوں، تمہارا شہر میں رہنا موجب تقویت دل تھا۔ گو نہ ملتے تھے۔ پر ایک شہر تو رہتے تھے۔ بھائی، ایک سیر دیکھ رہا ہوں۔ کئی آدمی طیور آشیاں گم کردہ کی طرح ہر طرف اڑتے پھرتے ہیں۔ ان میں سے دو چار بھولے بھٹکے کبھی یہاں بھی آ جاتے ہیں۔ لو صاحب، اب وعدہ کب وفا کرو گے؟ علائی کو کب بھیجو گے؟ ابھی تو شب کے چلنے اور دن کے آرام کرنے کے دن ہیں۔ بارش شروع ہو جائے گی تو آپ کی اجازت بھی کام نہ آئے گی۔ چلنے والا کہے گا۔ میں رہرو چالاک ہوں۔ تیراک نہیں ،لوہارو سے دہلی تک کشتی بغیر کیونکر جاؤں؟ دخانی جہاز کہاں سے لاؤں؟

اے زفرصت بے خبر در ہرچہ باشی زود باش

استاد میر جان صاحب کو سلام

یوم الخمیس ۷ محرم ۱۲۸۱ھ

(۲۲ جون ۱۸۶۴ء

علائی کے دیدار کا طالب، غالب

(۳)

برادر صاحب جمیل المناقب عمیم الاحسان، سلامت!

تمہاری تفریح طبع کے واسطے ایک غزل نئی لکھ کر بھیجی ہے، خدا کرے پسند آئے اور مطرب کو سکھائی جائے۔

آج شہر کے اخبار لکھتا ہوں۔ سوانح لیل ونہار لکھتا ہوں۔ کل پنجشنبہ ۲۵ مئی کو اول زور بڑے زور کی آندھی آئی۔ پھر خوب مینہ برسا۔ وہ جاڑا پڑا کہ شہر کرہ زمہر ہوگیا۔ بڑے دریبہ کا دروازہ ڈھایا گیا۔ قابل عطار کے کوچے کا بقیہ مٹایا گیا

۱۔ یعنی دہلی آجاؤ گے تو اول آب وہوا بدل جائے گی۔ اس سے صحت کو فائدہ پہنچے گا۔ دوسرے دہلی میں طبیب بکثرت موجود ہے ان سے طبی مشورے لیے جاسکیں گے۔ اور علاج کا انتظام بہتر ہو جائے گا۔ تیسرے دوستوں اور محبتوں سے صحبتیں رہیں گی اور لوہارو میں یہ باتیں میسر آسکتیں۔ ۲۔ اس زمانے میں لوہارو جانے کے لیے ریل نہ تھی۔ گرمی کے موسم میں سفر عام طور پر رات کو کرتے تھے اور دن کے وقت آرام لیتے تھے۔ میرزا کا مطلب یہ ہے کہ، اگر برسات شروع ہو جائے گی تو راستوں میں پانی بھر جائے گا۔ اس وقت علائی کو دہلی آنے کی اجازت دینا بالکل بے نتیجہ گا۔۔ وہ آنہیں سکے گا۔

کشمیری کٹریت کی مسجد زمین کا پیوند ہوگئی۔ سڑک کی وسعت دوچند ہوگئی۔ اللہ اللہ گنبد مسجدوں کے ڈھائے جاتے ہیں۔ اور ہنود کی ڈیوڑھیوں کی جھنڈیوں کے

پرچم لہراتے ہیں۔ ایک شیر زور اور پیل تن بند پیدا ہوا ہے۔ مکانات جا بجا ڈھاتا پھرتا ہے فیض اللہ خاں بنگش کی حویلی پر جو گلدستے ہیں جنکو عوام گمزی کہتے ہیں۔ انھیں ہلا ہلا کر ایک ایک کی بنیاد ڈھادی۔ اینٹ سے اینٹ بجادی۔ واہ رے بندر، یہ زیادتی اور پھر شہر کے اندر ریگستان کے ملک سے ایک سردار زادہ کثیر العیال عسیر الحال عربی، فارسی، انگریزی تین زبانوں کا عالم دلی میں وارد ہوا ہے۔ بلی ماروں کے محلے میں ٹھہرا ہے۔ بحسب ضرورت حکام شہر سے مل لیتا ہے۔ باقی گھر کا دروازہ بند کیے بیٹھا رہتا ہے۔ گاہ گاہ، نہ ہر شام و پگاہ غالب علی شاہ درویش کے تکیے پر آ جاتا ہے۔ اہل شہر حیران ہیں کہ کھاتا کہاں سے ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ باپ سے پھر گیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ بے سبب باپ کی نظر سے گر گیا ہے۔ دیکھیے انجام کار کیا ہو۔ غالب علی شاہ کا قول یہ ہے کہ کل کا بھلا ہو۔

جمعہ ۲۶ مئی ۱۸۶۵ء

(۴)

برادر صاحب جمیل المناقب عمیم الاحسان سلامت!

بعد سلام مسنون و دعاے بقاے دولت روز افزوں عرض کیا جاتا ہے کہ عطوفت نامہ کی رو سے فارسی دو غزلوں کی رسید معلوم ہوئی۔ تیسری غزل گو ہر نتواں گفت، اختر نتواں گفت، جو تمہارے حسب الطلب بھیجی گئی ہے۔ کیا نہیں پہنچی، بے شبہ پہنچی ہوگی۔ تم بھول گئے ہو گے۔ وکیل حاضر باش دربار اسد اللّٰہی یعنی علائی مولائی نے اپنے موکل کی خوشنودی کے واسطے فقیر کی گردن پر سوار ہو کر ایک اردو کی غزل لکھوائی۔ اگر پسند آئے تو مطرب کو سکھائی جائے۔ جھنجوٹی کے اونچے سروں میں راہ رکھوائی جائے۔ اگر جیتا رہا تو جاڑوں میں آ کر میں بھی سن لوں گا۔ والسلام مع الاکرام

چہار شنبہ ۲۔ ربیع الاول ۱۲۸۲ھ

نجات کا طالب، غالب

غزل

میں ہوں مشتاق جفا، مجھ پہ جفا اور سہی!
تم ہو بید اد سے خوش ، اس سے سو اور سہی

غیر کی مرگ کا غم کس لیے اے غیرت ماہ
ہیں ہوں پیشہ بہت، وہ نہ ہوا وہ نہ ہوا اور سہی

تم ہو بت پھر تمہیں پندار خدائی کیوں ہو؟
تم خداوندی کہلاؤ، سد اور ہاں

حسن میں حور سے بڑھ کر نہیں ہونے کے کبھی
آپ کا شیوہ انداز و ادا اور سہی

تیرے کوچے کا ہے مائل دل مضطر میرا
کعبہ اک اور سہی ، قبلہ نما اور سہی

کوئی نیا میں مگر باغ نہیں ہے وہ
خلد بھی باغ ہے۔ خیر آب وہوا او سہی

کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملا لیں یا رب
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

مجھ کو وہ دو کہ جسے کھا کے نہ پانی مانگوں
زیر کچھ اور سہی، آب بقا او ر سہی

مجھ سے غالب یہ علائی نے غزل لکھوائی
ایک بیداد گر رنج فزا اور سہی

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved.

(۵)

بھائی صاحب!

آج تک سوچتا رہا کہ بیگم صاحبہ قبلہ کے انتقال کے باب میں تم کو کیا لکھوں۔ تعزیت کے واسطے تین باتیں ہیں، اظہارِ غم، تلقینِ صبر دعائے مغفرت، سو بھائی اظہارِ غم تکلف محض ہے۔ جو غم تم کو ہوا ہے، ممکن نہیں کہ دوسرے کو ہوا ہو، تلقینِ صبر بے دردی ہے۔ یہ سانحہ عظیم ایسا ہے۔ جس نے غم رحلت نواب مغفور کو تازہ کیا۔ پس ایسے موقع پر صبر کی تلقین کیا کی جائے۔ وہی دعائے مغفرت، میں کیا اور میری دعا کیا؟ مگر چونکہ وہ میری مربیہ و محسنہ تھیں۔ دل سے دعا نکلتی ہے معہذا تمہارا یہاں آنا سنا جاتا تھا۔ اس واسطے خط نہ لکھا۔ اب جو معلوم ہوا کہ دشمنوں کی طبیعت ناساز ہے۔ اور اس سبب سے آنا نہ ہوا۔ یہ چند سطریں لکھیں گئیں۔ حق تعالیٰ کو سلامت اور تندرست اور خوش رکھے۔

۱۵ نومبر   تمہاری خوشی کا طالب، غالب

(۶)

جمیل المناقب عمیم الاحسان، سلامت

بعد سلام مسنون و دعاے بقاے دولت روز افزوں، عرض کیا جاتا ہے کہ اس تا د میرن جائے آئے اور ان کی زبانی تمہاری خیر و عافیت معلوم ہوئی۔ خدا تم کو زندہ تندرست و شاد و شادماں رکھے۔

یہاں کا حال کیا لکھوں؟ بقول سعدی علیہ الرحمۃ، نہ ماندہ آب جز چشم در یتیم، شب و روز آگ برستی ہے یا خاک، نہ دن کو سورج نظر آتا ہے۔ نہ رات کو تارے۔ زمین سے اٹھتے ہیں شعلے۔ آسمان سے گرتے ہیں شرارے۔ چاہا تھا کہ کچھ گرمی کا حال لکھوں۔ عقل نے کہا کہ دیکھ ناداں، قلم انگریزی دیا سلائی کی طرح جل اٹھے گی اور کاغذ کو جلا دے گی۔ بھائی، ہوا کی گرمی تو بڑی بلا ہے، گاہ گاہ جو ہوا بند ہو جاتی ہے۔ وہ اور بھی جاں گزا ہے۔

خراب فصل سے قطع نظر ایک دکھ غریب الوطن کے اختلاط کی گرمی کا ذکر کرتا ہوں کہ وہ جانسوز نہیں بلکہ دل افروز ہے۔ پرسوں فرخ میرزا آیا اس کا باپ بھی اس کے ساتھ تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیوں صاحب، میں تمہارا کون ہوں اور تم میرے کون؟ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا کہ حضرت آپ میرے دادا ہیں اور میں آپ کا پوتا ہوں۔ پھر میں نے پوچھا کہ تمہاری تنخواہ آئی؟ جناب عالی، آ کا جان کی تنخواہ آ گئی ہے میری نہیں آئی۔ میں نے کہا تو لوہارو جائے تو تنخواہ پائے۔'' کہا ''حضرت میں تو آ کا جان سے روز کہتا ہوں کہ لوہارو چلو، اپنی حکومت

چھوڑ کر دلی کی رعیت میں کیوں مل گئے؟''

سبحان اللہ! بالشت بھر کا لڑکا اور یہ فہم درست اور طبع سلیم میں اس خوبی خو اور فرخی سیرت پر اس کو فرخ سیر کہتا ہوں مصاحب بے بدل ہے۔ تم اس کو بلا کیوں نہیں بھیجتے۔ مگر بھائی غلام حسین خاں مرحوم کے متبع ہو کہ زین العابدین و حیدر حسن اور ان کی اولاد کو کبھی منہ نہ لگایا۔ وعلاؤ الدین خاں جیسا ہوشمند و ہمہ دان بیٹا۔ فرخ سیر جیسا دانشور، بذلہ سنج اور شیریں سخن پوت ا۔ یہ دو عطیہ عظمی و موہبت کبری ہیں تمہارے واسطے من جانب اللہ:

اگر	دریافتی	،	بر داشت بوس
دگر	غافل شدی	افسوس	افسوس

آج ۲۲ جون کی ہے، آفتاب سرطان میں آ گیا۔ نقطہ انقلاب صیفی میں دن گھٹنے لگا، چاہیے کہ تمہارا غیظ و غضب ہر روز کم ہوتا جائے۔ نجاب کا طالب، غالب

علاؤالدین احمد خاں علائی

(۱)

میرزا نسیمی کو دعا پہنچے!

آنکھ کی گہاجنی جب پک کر پھوٹ گئی تھی اور پک کر پیپ نکل گئی تھی تو نشتر کیوں کھایا؟ مگر یہ کہ بطریق خوشامد طبیب سے رجوع کیا۔ جب اس نے نشتر تجویز کیا۔ خواہی نخواہی امتثال امر کرنا پڑا اور شاید یوں نہ ہو، کچھ مادہ باقی ہو۔ بہر حال حق تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے شفا بخشے!

قطعہ

بسکہ فعال ما یرید ہے آج
ہر سلحشور انگلستان کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے
زہرہ ہوتا ہے آب انسان کا
چوک جس کو کہیں، وہ مقتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا

ہونے لگا جس طرح آپا جان والدہ کے لیے حالانکہ آپا کے معنی بڑی بہن کے ہیں۔ یہاں آ کا جان سے مراد علاؤ الدین احمد خاں ہیں ا، غلام حسین خان مسرور جو میرزا غالب کے ہم زلف اور زین العابدین خاں عارف کے والد تھے۔ انھوں نے اپنی بیوی بنیادی بیگم اور اس کے بچوں کو بالکل چھوڑ رکھا تھا اور سنگی بیگم نام ایک خاتون سے شادی کر لی تھی۔ میرزا کہتے ہیں کہ امیں الدین احمد خاں بھی مسرور کے متبع ہو گئے اور اپنے بچوں کو چھوڑ دیا ۲، گرمیوں میں سب سے بڑا دن ۲۱ جون کا ہوتا ہے۔ پھر دن گھٹنے لگتا ہے اور رات بڑھنے لگتی ہے۔ اس لحاظ سے ۲۲ جون سے دن گھٹنے لگا جس طرح ۲۱ دسمبر نقطہ انقلاب شتائی ہے اور ۲۲ دسمبر سے رات گھٹنے لگتی ہے۔۳، میرا اندازہ ہے کہ یہ خط جون ۱۸۶۷ء کا ہوگا۔ اس میں امیر الدین احمد خاں عرف فرخ میرزا سے گفتگو کا مفاد درج کیا ہے۔ انکی پیدائش ۱۸۶۱ء میں

ہوئی۔اس لیے انھیں بالشت بھر کا لڑکا بتایا گیا ہے۔۴، علائی کا تخلص پہلے نسیمی تھا ۵، یعنی جو چاہے کرنے والا مطلق العنان، فاعل مختار ۶ ہتھیار استعمال کرنے والا یعنی سپاہی۔ ۷، چوک سے یہاں بظاہر چاندنی چوک مراد ہے۔اس میں بعد غدر کوتوالی کے سامنے لوگوں کو پھانسیاں دی جاتی تھے

شہر دہلی کا ذرہ ذرہ خاک
کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک

آدمی واں نہ جا سکے، یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا

وہی رونا تن و دل و جان کا
گاہ جل کر کیا کیے شکوہ

سوزش داغ ہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیے باہم

ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا
اس طرح کے وصال سے یارب

کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا

۱۸۵۸ء

(۲)

آج بدھ کے دن ۲۷ رمضان کو پہر دن چڑھے کہ جس وقت میں کھانا کھا کر باہر آیا تھا۔ ڈاک کا ہرکارہ تھا تمہارا خط اور شہاب الدین خان کا کا خط معالایا۔ مضمون دونوں کا ایک۔ واہ کیا مضمون، ان دنوں میں کہ سب طرح کے رنج و عذاب فراہم ہیں، ایک داغ جگہ سوز یہ بھی ضرور تھا۔ سبحان اللہ میں نے اس کی صورت بھی نہیں دیکھی۔ یا ولایت کی تاریخ سنی یا اب رحلت کی تاریخ لکھنی پڑی، پرودگار تم کو جیتا رکھے اور نعم البدل عطا کرے۔

میاں اس کو سب جانتے ہیں کہ میں مادہ تاریخ نکالنے میں عاجز ہوں۔ لوگوں کے دیے ہوئے مادے نظم کر دیتا ہوں اور جو مادہ اپنی طبیعت سے پیدا کرتا ہوں۔ وہ بیشتر لچر ہوا کرتا ہے چنانچہ اپنے بھائی کی رحلت کا مادہ۔ دریغ دیوانہ، نکالا، پھر اس میں سے آہ ہے، کے سولہ عدد گھٹا دیے۔

تمام دوپہر فکر میں رہا۔ یہ نہ سمجھنا کہ مادہ ڈھونڈا۔ تمہارے نکالے ہوئے دو لفظوں کو تاکا کیا کہ کسی طرح سات اس پر بڑھاؤں۔ بارے ایک قطعہ درست ہوا۔ مگر تمہاری زبان سے، گویا تم نے کہا ہے پانچ شعر ہیں۔ تین شعر زائد۔ دو موضح مدعا لیکن میں نہیں جانتا کہ تعمیہ اچھا ہے یا برا۔ ہاں اغلاق تو البتہ ہے۔ تامل سے سمجھ میں آتا ہے اور شاید لوح مزار پر کھدوانے کے

۱، یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ قطعہ ان حالات سے متاثر ہو کر لکھا گیا جو غدر

کے بعد دہلی میں پیدا ہو گئے تھے۔ اسی لیے کہا کہ انگریزوں کے سپاہی مطلق العنان ہیں جو چاہتے ہیں کرتے ہیں۔ کسی کو گھر سے بازار تک جانے کا حوصلہ نہیں، چوک مقتل بنا ہوا ہے اور دہلی کا ایک ایک ذرہ مسلمانوں کے خون کا پیاسا ہے۔

۳، شہاب الدین احمد خاں ثاقب ابن ضیاء الدین احمد خاں نیر ۳، علائی کے بچے کی وفات کا ذکر ہے جس کا نام یحییٰ تھا۔ ۴، میرزا یوسف جس نے غدر کے دوران میں ۲۹ صفر ۱۲۷۴ھ (۱۹ اکتوبر ۱۸۵۷) کو دہلی میں بحالت دیوانگی وفات پائی۔ غالب نے تاریخ وفات کہی تھی۔

زساں مرگ ستم دیدہ میرزا یوسف
کہ زیستے بہ جہاں در، زخویش بیگانہ
یکے در انجمن از من ہے پژوہش کرد
کشیدم آہے و گفتم، دریغ دیوانہ ''

۵، مدعا کو واضح کرنے والے ۶، تعمیہ اصطلاحاً اصل مادے میں اعداد بڑھانے اور شامل کرنے کو کہتے ہیں۔ تفصیل خود اس خط کے آخر میں درج ہے۔ ۷، اخلاق پچیدگی۔ قابل نہ ہو۔

قطعه

در گریه اگر دعوی ہم چشمی ما کرد
بینی که شود ابر بہاری خجل از ما
ناچار بگریم شب و روز که این سیل
باشد که برد کالبد آب و گل از ما
گفتی که نگہدار دل از کشمکش غم
خود گرد آورد غم جاں گسل از ما
یحییٰ شده از شعله سوز غم ہجرش
چوں شمع دور دور بسر متصل از ما
غم دیده سیمی پئے تاریخ وفاتش
بنوشت که در داغ پسر سوخت دل از ما

''ما'' کے عدد ۴۱ ''دل'' کے عدد ۳۴۔ ''ما'' میں سے ''دل'' گیا، گویا ۴۱ میں سے ۳۴ گئے۔ باقی رہے سات، وہ داغ پسر پر بڑھائے، ۱۲۷۴ ہاتھ آئے۔

۲۷ رمضان ۱۲۷۴ (۱۱ مئی ۱۸۵۸)

(۳)

خاک نمناکم و تو باد بہار
نہ توانی مرا زجا بردار
ہاں دنیسیمی زمن چہ می خواہی
زحمت خویش چہ می خواہی

خوشی مجھ میں تجھ میں مشترک ہے۔ تم نے مجھے تہنیت دی تو مبارک اور میں نے تمھیں تہنیت دی تو مناسب، الحمد للہ، اللہ شکر۔

بھائی، سچ تو یہ ہے کہ ان دنوں میں میرے ٹکٹ نہیں۔ اگر بیرنگ بھیجوں تو کہا ماندہ۔ اٹھ نہیں سکتا۔ ڈاک گھر تک جائے کون، اپنا مقصود تمھارے والد ماجد سے اور تمھاری جدہ ماجد اور تمھارے عم عالی مقدار سے کہہ چکا ہوں۔ خلاصہ یہ کہ میری بی بی اور بچوں کو کہ یہ تمھاری قوم کے ہیں، مجھ سے لے لو کہ اب اس بوجھ میں اب اس بوجھ کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ انھوں نے بھی۔ بشرط ان لوگوں کے

۱۔ مثنوی کے شعر ہیں لیکن تمام نسخوں میں "جابر دن" چھپا ہوا ہے۔ یہاں تک کہ منشی مہیش پرستاد صاحب نے بھی اسی طرح چھاپا۔ لیکن ذرا غور کرنے سے غلطی واضح ہو جاتی ہے۔ غالب قادر الکلام شاعر تھا اور غیر ممکن تھا کہ وہ دو شعر متصل لکھتا، جو نہ رباعی کے تھے اور نہ قطعے کے۔ صحیح جابرون نہیں جابر دار ہی ہوسکتا ہے۔ اس مصرع کا ایک نسخہ یہ بھی ہے۔ کے توانی مرزا جابردار۔ ۲، نواب امین الدین احمد خاں والی

لوہارو۔ ۳، نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر۔ ۴، بی بی امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں کے سگے چچا کی بیٹی تھی۔ وہ بچے باقر علی خاں اور حسین علی خاں۔ زین العابدین خاں عارف کے بیٹے تھے۔ عارف، نواب غلام حسین خاں مسرور کا فرزند تھا۔ مسرور امین الدین احمد خاں کا ہم خاندان تھا۔ نیز اس کی شادی بیگم غالب کی سگی بہن سے ہوئی تھی۔ گویا بچوں سے لوہارو والوں کا دوہرا رشتہ تھا۔

لوہارو جانے کی، اس خواہش کو قبول کیا۔ میرا قصد سیاحت کا ہے۔ پنشن اگر کھل جائے تو وہ اپنے صرف میں لایا کروں گا۔ جہاں جی لگا، وہاں رہ گیا، جہاں سے دل اکھڑا چل دیا۔

تا درمیانہ خواستہ کرد گار چیست

دوشنبہ ۱۳ محرم ۱۲۷۵ھ

غالب

(مطابق ۲۳ اگست ۱۸۵۸ء)

All rights reserved. ©2002-2006

(۴)

سبحان اللہ ہزار برس تک نہ پیام بھیجنا، نہ خط لکھنا اور پھر لکھنا تو سراسر غلط لکھنا، مجھ سے کتاب مستعار مانگتے ہو، یاد کرو کہ تم کو لکھ چکا ہوں کہ دساتیر اور برہان قاطع کے سوا کوئی کتاب میرے پاس نہیں۔ ازاں جملہ برہان قاطع، تم کو دے چکا ہوں، دساتیر میرا ایمان و حرز جان۔ اشعار تازہ مانگتے ہو، کہاں سے لاؤں؟ عاشقانہ اشعار سے مجھ کو وہ بعد ہے جو ایمان سے کفر کو۔ گورنمنٹ کا بھاٹ تھا۔ جنٹی کرتا تھا، خلعت پاتا تھا، خلعت موقوف۔ جنٹی متروک، نہ غزل نہ مدح، ہزل نہ ہجو میرا آئین نہیں پھر کہو کیا لکھوں؟ بوڑھے پہلوان کے سے پیچ بتانے کو رہ گیا ہوں۔ اکثر اطراف و جوانب سے اشعار آ جاتے ہیں اصلاح پاتے ہیں۔ باور کرنا اور مطابق واقعہ سمجھنا۔

تمہارے دیکھنے کو دل بہت چاہتا ہے اور دیکھنا تمہارا موقوف اس پر ہے کہ تم یہاں آؤ۔ کاش اپنے والد ماجد کے ساتھ چلے آئے اور مجھ کو دیکھ جاتے۔ اردو کا دیوان رام پور سے لایا ہوں اور وہ آگرہ گیا ہے۔ وہاں منطبع ہوگا۔ ایک نسخہ تمہارے پاس بھی پہنچ جائے گا۔

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

مرقومہ روز دوشنبہ ۲ جولائی ۱۸۶۰ء

غالب

(۵)

صاحب، میری داستان سنیے۔ پنسن بے کم و کاست جاری ہوا۔ زرِ مجتمعہ سہ رسالہ یک مشت مل گیا۔ بعد ادائے حقوق چار سو روپے دینے باقی رہے اور ستاسی روپے گیارہ آنے مجھے بچے۔ مئی کا مہینا بدستور ملا۔ آخر جون میں حکم ہو گیا کہ پنسن دار علی العموم ششماہی پایا کریں۔ ماہ بماہ پنسن تقسیم نہ ہوا کرے۔

میں دس بارہ برس سے حکیم محمد حسن خاں کی حویلی میں رہتا ہوں۔ اب ہو حویلی غلام اللہ نے مول لے لی۔ آخر جون میں مجھ سے کہا کہ حویلی خالی کر دو۔ اب مجھے فکر پڑی کہیں دو حویلیاں قریب ہمد گر ایسی ملیں کہ ایک محلسرا اور ایک دیوان خانہ ہو۔ نہ ملیں۔ ناچار یہ چاہا کہ بلی ماروں میں ایک مکان ایسا ملے کہ جس میں جا رہوں۔ نہ ملا تمہاری چھوٹی پھوپی نے بیکسیں نوازی کی۔ کڑوڑ والی حویلی مجھ کو رہنے کو دی۔ ہر چند وہ رعایت مرعی نہ رہی کہ محلسرا اسے قریب ہو مگر خیر، بہت دور بھی نہیں۔ کل یا پرسوں وہاں جا رہونگا ایک پانو زمین پر ہے۔ ایک پانو رکاب میں توشے کا وہ حال گوشے کی یہ صورت۔

کل شنبہ ۷ ذی الحجہ کی اور ۷ جولائی کی۔ پر دن چڑھتے تمہارا خط پہنچا۔ دو گھڑی بعد سنایا گیا کہ امین الدین خاں صاحب نے اپنی کوٹھی میں نزول اجلال کیا۔ پہر دن رہے از راہ مہربانی ناگاہ میرے پاس تشریف لائے۔ میں نے انکو دبلا اور افسردہ پایا۔ دل کڑھا۔ علی حسین خاں بھی آیا۔ اس سے بھی ملا۔ میں نے تمہیں پوچھا کہ وہ نہیں آئے۔ بھائی صاحب بولے کہ جب میں یہاں آیا تو کوئی وہاں

بھی تو رہے اور اس سے علاوہ وہ اپنے بیٹے کو بہت چاہتے ہیں۔ میں نے کہا اتنا ہی جتنا ہم تم اس کو چاہتے تھے؟ ہنسنے لگے۔ غرض کہ میں نے بظاہر ان کو تم سے اچھا پایا۔ آگے تم لوگوں کے دلوں کا مالک اللہ ہے۔

نگاشتہ و رواں داشتہ یک شنبہ بین الظہر و العصر

راقم، غالب

۱۸، ذی الحجہ ۱۲۷۶ھ (۸ جولائی ۱۸۶۰ء)

(۶)

مولانا نسیمی!

کیوں خفا ہوتے ہو؟ ہمیشہ سے اسلاف و اخلاف ہوتے چلے آئے ہیں۔ اگر نیر خلیفہ اول ہے تو تم خلیفہ ثانی ہو اس کی عمر میں تم پر تقدم زمانی ہے جانشین دونوں مگر ایک اول اور ایک ثانی ہے۔

شیر اپنے بچوں کو شکار کا گوشت کھلاتا ہے۔ طریق صید افگنی سکھاتا ہے۔ جب وہ جوان ہو جاتے ہیں۔ آپ شکار کر کھاتے ہیں۔ تم سخنور ہو گئے۔ حسن طبع خداداد رکھتے ہو۔ ولادت فرزند کی تاریخ کیوں نہ کہو؟ اسم تاریخی کیوں نہ نکال لو کہ مجھ پر غم زدہ دل کو تکلیف دو؟ علاؤالدین خاں، تیری جان کی قسم، میں نے پہلے لڑکے کا اسم تاریخی نظم کر دیا تھا اور وہ لڑکا نہ جیا۔ مجھ کو اس وہم نے گھیرا ہے کہ میری نحوست طالع کی تاثیر تھی۔ میرا ممدوح جیتا نہیں۔ نصیرالدین حیدر اور امجد علی شاہ ایک ایک قصیدے میں چل دیے۔ واجد علی شاہ تین قصیدوں کے متحمل ہوئے۔ پھر نہ سنبھل سکے۔ جس کی مدح میں دس بیس قصیدے کہے گئے۔ وہ عدم سے بھی پرے پہنچا۔ نہ صاحب وہائی خدا، میں نہ تاریخ ولادت کہوں گا۔ نہ نام تاریخی ڈھونڈوں گا۔ حق تعالیٰ تم کو اور تمہاری اولاد کو سلامت رکھے اور عمر و دولت و اقبال عطا کرے۔

سنو صاحب۔ حسن پرستوں کا ایک قاعدہ ہے۔ وہ امرد کو دو چار برس گھٹا کر دیکھتے ہیں۔ جانتے ہیں کہ جوان ہے، لیکن بچہ سمجھتے ہیں۔ یہ حال تمہاری قوم کا ہے۔ قسم شرعی کھا کر کہتا ہوں کہ ایک شخص کہ اس کی عزت اور نام آدمی جمہور کے

نزدیک ثابت اور محقق ہے اور صاحب، تم بھی جانتے ہو، مگر جب تک اس سے قطع نظر نہ کرو اور اس مسخرے کو گمنان و ذلیل نہ سمجھو۔ تم کو چین نہ آئے گا۔ پچاس برس سے دلی میں رہتا ہوں۔ ہزار ہا خط اطراف و جوانب سے آتے ہیں۔ بہت لوگ ایسے ہیں کہ محلّہ سابق کا نام لکھ دیتے ہیں۔ حکام کے خطوط فارسی و انگریزی۔ یہاں تک کہ ولایت کے آئے ہوئے، صرف شہر کا نام اور میرا نام، یہ سب مراتب تم جانتے ہو اور ان خطوط کو تم دیکھ چکے ہو اور پھر مجھ سے پوچھتے ہو کہ اپنا مسکن بتا۔ اگر میں تمہارے نزدیک امیر نہیں نہ سہی، اہل حرفہ سے بھی نہیں ہے۔ کہ جب تک محلّہ اور تھانہ لکھا جائے ہرکارہ میرا پتا نہ پائے۔ آپ صرف دہلی لکھ کر میرا نام لکھ دیا کیجیے، خط پہنچے کا میں ضامن۔

پنجشنبہ ۴ ماہ اپریل ۱۸۶۱ء

غالب

(۷)

میری جان تخلص تمہارا بہت پاکیزہ اور میرے پسند ہے۔ پشمی کو بے تکلف اس کا مصحف کیوں ٹھہراؤ یہ میدان تو بہت فراخ ہے۔ خدا کی خے کو جیم فارسی سے بدل دو۔ نبی کو بتقدیم موحدہ علی انون لکھو۔ یہ وساوس دل سے دور کرو۔ رہرو ایک اچھا شخص ہے۔ رہرو۔ اس کی تجنیس موجود ہے۔ شیون اچھا تخلص ہے۔ ستون اس کی تصحیف ہے۔ تمہارے واسطے بمناسبت اسم عالی تخلص خوب تھا مگر اس تخلص کا ایک شاعر بہت بڑا نامی گزر چکا ہے۔ ہاں ''نامی'' ''سامی'' یہ دو تخلص بھی اچھے، مولانا فائق کی پیروی کرو، مولانا لائق کہلاؤ اگر کہو گے اس ترکیب سے لفظ نالائق۔ پیدا ہوتا ہے مولانا شائق بن جاؤ۔

ہنسی کی باتیں ہو چکیں۔ اب حقیقت واجبی سنو۔ نسیمی تخلص خماسی بروزن ظہوری۔ وظیری اچھا ہے۔ اگر بدلنا منظور ہے تو نامی سامی رہرو شیون یہ چار تخلص رباعی بروزن عرفی، وہ غالب اچھے ہیں۔ ان میں سے ایک تخلص قرار دو۔ میرے نزدیک سب سے بہتر تمہارے واسطے خاص ہنری تخلص ہے۔ کہو گے کہ آزادپور

ا، عبارت سے ظاہر ہے کہ علائی نے غالب سے محلے کا پتا پوچھا تھا۔ اس سے میرزا کے احساس شہرت وعظمت کو ٹھیس لگی اور نہایت دل چسپ انداز میں اس کا اظہار کیا۔ ۲، تصحیف کا مطلب ہے نقطے بدل کر دوسرا لفظ بنالینا جیسے نسیمی سے پشمی۔ مصحف یعنی تصحیف شدہ ۳، یعنی خدا کو جدا بنایا جا سکتا ہے۔ نبی کی ب کو ن پر مقدم کر دو تو

بنی بن جائے گا۔ اشارہ ہے نعمت خاں عالی کی طرف جو عالمگیر اعظم کا خانساماں تھا اور مشہور شاعر ہونے کے علاوہ فارسی کا علی پایہ نثر نگار تھا۔ وقائع حسن و عشق اور جنگ نامہ اس کی متداول کتابیں ہیں۔ دیوان بھی چھپ چکا ہے۔ آخر میں دانشمند خاں خطاب پایا تھا۔ یعنی پنج حرفی ے چار حرفی۔

کے باغ کے ایک آم کا نام فخری ہے۔ حاصل کلام دو دن کی فکر میں جو تخلص میرے خیال میں آئے۔ وہ آج لکھ بھیجتا ہوں۔ بھائی موبد تخلص نیا ہے۔ اگر یہ پسند آ جائے تو یہ رکھو۔ والدعا

صبح یک سنبہ ۱۲ مئی ۱۸۶۱ء

نجات کا طالب، غالب

(۸)

میری جان علائی ہمدان!

اس دفع دخل مقدر کا کیا کہنا ہے۔ فرہنگ لغات دساتیر، تمہارے پاس ہے میں چاہتا ہوں کہ اس کی نقل تم اسے منگاؤں تم نے دساتیر مجھ سے مانگی۔ اسی صحیفہ مقدس کی قسم کہ وہ میرے پاس نہیں ہے۔ جی میں کہو گے کہ اگر دساتیر نہیں تو فرہنگ کی خواہش کیوں ہے حق تو یوں ہے کہ بعض لغات کے اعراب یاد نہیں۔ اس واسطے فرہنگ کی خواہش ہے۔ اگر اس فرہنگ، کی نقل بھیج دو گے تو مجھ پر احسان کرو گے۔ دساتیر میرے پاس موجود ہوتی تو آج اس خط کے ساتھ اس کا بھی پارسل بھیج دیتا۔ ہاں صاحب، اگر دساتیر، ہوتی اور میں بھیج دیتا تو البتہ بھائی صاحب کا مشکور ہوتا۔ دین نہ دنیا میں کیوں ماجور ہوتا؟ ارسال اہدا پر حصول اجر کیوں مترتب ہو گیا بھائی وہ مذہب اختیار کیا چاہتے ہیں اور تم اس مذہب کو حق جانتے ہو کہ جو واسطہ اس کے اعلان وشیوع کا ہوتا تو عنداللہ مجھ کو استحقاق اجر پانے کا پیدا ہوتا۔ اپنے باپ کو سمجھاؤ اور ایک شعر میرا اور ایک شعر حافظ کا اور ایک شعر مولوی روم کا سناؤ۔

غالب:

دولت بہ غلط ہود از سعی پشیماں شو

کافر نتوانی شد، ناچار مسلماں شو

حافظ:

جنگ ہستاد دو ملت ہمہ را غدر بند
چوں نہ دید ند حقیقت رہِ افسانہ زدند

مولانا روم:

مذہب عاشق ز مذہبا جداست
عاشقاں را مذہب و ملت خداست

رات کو خوب مینہ برسا ہے۔صبح کو تھم گیا ہے۔ہوا سرد چل رہی ہے۔ابر تنگ چھا رہا ہے۔یقین ہے کہ تمہاری جدہ کا ماجدہ مع اپنی بہو اور پوتے کے روانہ لوہارو ہوں۔کل آج کی روانگی کی خبر تھی۔یہ لڑکا سعید ازلی ہے۔ابر کا محیط ہونا اور ہوا کا سرد ہو جانا خاص اس کی آسائش کے واسطے ہے۔میرا منتظر سر راہ ہے۔وہاں بیٹھا ہوا یہ خط لکھ رہا ہوں۔محمد علی بیگ ادھر سے نکلا۔

بھئی محمد علی بیگ، لوہارو کی سواریاں روانہ ہو گئیں؟

حضرت ابھی نہیں!

ا۔ ''دفع دخل مقدر'' سے مراد ہے سوال کا دروازہ پہلے ہی بند کر دینا۔۲۔امین الدین احمد خان والد علائی۔۳۔ہدیہ بھیجنا۔

کیا آج نہ جائیں گی؟

آج ضرور جائیں گی، تیاری ہو رہی ہے۔

مرقومہ شنبہ یکم جون وقت ۶ بجے کے عمل میں ۱۸۶۱ء

غالب

(۹)

جان غالب!

یاد آتا ہے کہ تمہارے عم نامدار سے سنا تھا کہ لغات ''دساتیر'' کی فرہنگ وہاں ہے۔اگر ہوتی تو کیوں نہ بھیج دیتے۔

خیر:

آنچہ ما درکار داریم اکثرے درکار نیست

تم ثمر نورس ہو اس نہال کے کہ جس نے میری آنکھوں کے سامنے نشوونما پائی ہے اور میں ہوا خواہ و سایہ نشیں اس نہال کا رہا ہوں، کیونکر تم مجھ کو عزیز ہو گے۔ رہی دید وادید، اس کی دو صورتیں ہیں تم دلی میں آؤ یا میں لوہارو آؤں، تم مجبور، میں معذور خود کہتا ہوں کہ میرا عذر زنہار مسموع نہ ہو، جب تک نہ سمجھ لو کہ میں کون ہوں اور ماجرا کیا ہے؟

سنو، عالم دو ہیں۔ایک عالم ارواح اور ایک عالم آب و گل۔حاکم ان دونوں عالموں کا وہ ایک ہے جو خود فرماتا ہے لمن الملک الیوم؟ اور پھر آپ جواب دیتا ہے للہ الواحد القہار ہر چند قاعدہ عام یہ ہے کہ آب و گل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں، لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالم ارواح کے گنہ گار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں چنانچہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ء میں روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا۔ تیرہ برس حوالات میں رہا۔ ۷، رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوام حبس صادر ہوا۔ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلی شہر کو زنداں مقرر کیا اور مجھے اس

زنداں میں ڈال دیا۔ فکر نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا۔ برسوں کے بعد میں جیل خانہ سے بھاگا۔ تین برس بلاد شرقیہ پھرتا رہا۔ پایان کار مجھے کلکتہ سے پکڑ آئے۔ پھر اسی مجلس میں بٹھا دیا۔ جب دیکھا کہ یہ قیدی گریز پا ہے۔ دو ہتکڑیاں اور بڑھا دیں،۵، پانو بیڑی سے فگار، ہاتھ ہتکڑیوں سے زخم دار۔ مشقت مقرری اور مشکل ہوگئی۔ طاقت ایک قلم زائل ہوگئی ۔ بے حیا ہوں۔ سال گزشتہ بیڑی کو زاویہ زنداں میں چھوڑ مع دونوں ہتکڑیوں کے بھاگا۔ میرٹھ، مراد آباد ہوتا ہوا رام پہنچا۔ کچھ دن کم دو مہینے وہاں رہا تھا کہ پھر پکڑا آیا۔ اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگوں گا۔ بھاگوں کیا بھاگنے کی طاقت بھی تو نہ رہی۔ حکم رہائی دیکھیے کب صادر ہو۔ ایک ضعیف سا احتمال ہے کہ اسی ماہ ذی الحجہ ۱۲۷۷ء میں چھوٹ جاؤں۔ بہر تقدیر بعد رہائی کے تو آدمی سوائے اپنے گھر کے اور کہیں نہیں جاتا۔ میں بھی بعد

۱، ضیاالدین احمد خاں نیر ۲، یعنی پیدا ہوا۔ ۳، یعنی شادی ہوئی۔ بیڑی سے مراد بیوی ہے۔ ۴،

اس سے مراد کلکتہ کا سفر ہے، جس میں میرزا نے دو سال سات ماہ گزارے۔ ۵، ہتکڑیوں سے مراد عارف کے بچے باقر علی خاں اور حسین علی خاں ہیں جنھیں میرزا، عارف اور اس کی بیوی اور والدہ کی وفات کے بعد اپنے گھر لے آئے تھے۔ ۶، پہلے سفر رام پور کی طرف اشارہ ہے یعنی بیوی کو دلی میں چھوڑا اور بچوں کو ساتھ لے گئے۔ ۷، یعنی دیکھیے موت کب آئے؟

نجات سید عالم ارواح کو چلا جاؤں گا۔

فرخ آں روز کہ از خانہ زنداں بروم
سوئے شہر خود ازیں وادی ویراں بروم

گانے میں غزل کے سات شعر کافی ہوتے ہیں۔ دو فارسی غزلیں، دو اردو غزلیں اپنے حافظ کو تحویل میں بھیجتا ہوں۔ بھائی صاحب کی نذر:

از جس بجاں نقاب تا کے ؟
ایں گنج دریں خراب تا کے ؟
ایں گوہر پر فروغ یارب !
آلودہ خاک و آب تا کے ؟
ایں راہرو مسالک قدس
واماندہ خورد و خواب تا کے؟
بیتابی برق جز دے نیست
ماویں ہمہ اضطراب تا کے ؟
جاں درطلب نجات تا چند؟
دل در تعب عتاب تا کے ؟
غالب بہ چنیں کشاکش اندر
یا حضرت بوتراب تا کے ؟

دوش، کز گردش بختم گلہ بر روے تو بود
چشم سوئے فلک و روے سخن سوے تو بود

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

چہ عجب ، صانع اگر نقش دہانت گم کرد؟
کاں خود از حیرتیان رخ نیکو ے تو بود

بکف باد مباد ایں ہمہ رسوائی ، دل
کا آخر از پروگیان شکن موے تو باد

مردن جان و بہ تمنائے شہادت دادن
ہم از اندیشہ آرزوبا زدے تو بود

دوست وارم گرہے را کہ بکارم زدہ اند
کایں ہمان است کہ پیوستہ دار بروے تو بود

لالہ و گل دمداز از طرف مزارش پس مرگ
تا چہا در دل غالب ہوس روے تو بود

یہ غزل غالب کے فارسی کلیات میں شامل نہ ہوئی۔ سبد چین میں چھپی۔۲، یہ غزل کلیات فارسی میں موجود ہے لیکن اس کے بارہ شعر ہیں۔ بقیہ شعر یہ ہیں:

چرخ کج باخت بہ من، درخم دام تو فگند
نعل واژدن بلا حلقہ گیسوے تو بود

شب چہ دانی نہ تو در بزم بہ خوباں چہ گزشت
خاصہ بر صدر نشینے کہ بہ پہلوے تو بود

ہے بلکہ ہر اک ان کے اشارے میں نشاں اور
کرتے ہیں محبت توگزرتا ہے گماں اور

لوگوں کو ہے خورشید جہاں تاب کا دھوکا
ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغ نہاں اور
ہے خون جگر جوش میں ، دل کھول کے روتا
ہوتے جو کئی دیدہ خونابہ فشاں اور
یا رب نہ وہ سمجھے ہیں، نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل انکو جو نہ دے مجھ کو زباں اور
مرتا ہوں اس آواز پہ چند سر اڑجائے
جلا کو لیکن وہ کہے جائیں کہ ہاں اور
ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

— — — —

ا بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے
بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کیے
ضد کی ہے اور بات مگر خو بری نہیں
بھولے سے اس نے سیکڑوں وعدے وفا کیے
صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو
دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کیے
رکھتا پھروں ہوں خرقہ سجادہ رہن لے
مدت ہوئی ہے دعوت آب و ہوا کیے

کس روز تہمتیں نہ تراشا کیے عدو
کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کیے
غالب تمھیں کہو کہ ملے گا جواب کیا
مانا کہ تم کہا کیے اور وہ سنا کیے

ذی الحجہ ۱۲۷۷ھ (جون ۱۸۶۱ء)

خلد را از نفس شعلہ مے سوزم
تا نداند حریفاں کہ سر کوے تو بود
روش باد بہاری بہ گمانم افگند
کایں گل و غنچہ پے قافلہ بوے تو بود
ہم ازاں پیش کہ مشاطہ بہ آموز شود
نقش ہر شیوہ در آئینہ زانوے تو بود

۱، اردو دیوان میں اس غزل کے گیارہ شعر ہیں۔ باقی چار یہ ہیں:

ابرو کو ہے کیا اس نگہ ناز سے پیوند
ہے تیر مقرر مگر اس کی ہے کماں اور
ہر چند سبک دست ہوے بت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگ گراں اور
لیتا، نہ اگر دل تمھیں دیتا، کوئی دم چین
کرتا، جو نہ مرتا کوئی دن۔ آہ و فغاں اور

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved ©2002-2006

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

۲،اس غزل کے باقی شعر یہ ہیں:

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

(۱۰)

علائی مولائی!

اس وقت تمہارا خط پہنچا۔ ادھر پڑھا ادھر جواب لکھا۔ واہ کیا کہنا ہے؟ رام پور کے علاقہ کو گاؤ شنگ اور مجھ کو بیل یا اس پیوند کے طعنے کو تازیانہ اور مجھ کو گھوڑا بنایا۔ وہ علاقہ او وہ پیوند لوہارو کے سفر کا مانع و مزاحم کیوں ہو؟ رئیس کی طرف سے بطریق وکیل محکمہ کمشنری میں معین نہیں ہوں۔ جس طرح امرا واسطے فقرا کے وجہ معاش مقرر کر دیتے ہیں۔ اس طرح اس سرکار سے میرے واسطے مقرر ہے۔ ہاں فقیر سے دعاے خیر اور مجھ سے اصلاح نظم مطلوب ہے۔ چاہوں دلی رہوں چاہوں اکبر آباد چاہوں لاہور، چاہوں لوہارو، ایک گاڑی کپڑوں کے واسطے کروں کپڑوں کے صندوق میں آدھی درجن شراب دھروں۔ آٹھ کہار جھپکے کے لوں۔ چار آدمی رکھتا ہوں۔ دو یہاں چھوڑوں دو ساتھ لوں، چل دوں۔ رام پور سے جو لفافہ آیا کرے گا۔ لڑکوں کا حافظ لوہارو بھجوایا کرے گا۔ گاڑی ہو سکتی ہے۔ کہار بہم پہنچ سکتے ہیں۔ طاقت کہاں سے لاؤں؟ روٹی کھانے کو باہر کے مکان سے محلسرا میں کہ وہ بہت قریب ہے، جب جاتا ہوں تو ہندوستانی گھڑی بھر میں دم ٹھہرتا ہے اور یہی حال دیوان خانے میں آکر ہوتا ہے والی رام پور نے بھی مرشد زادہ کی شادی میں بلایا تھا۔ یہی لکھا گیا کہ میں اب معدوم محض ہوں۔ تمہارا اقبال تمہارا کلام کو اصلاح دیتا ہے۔ اس سے بڑھ کر مجھ سے خدمت نہ چاہو۔

بھائی کے اور تمہارے دیکھنے کو جی بہت چاہتا ہے، پر کیا کروں؟ عقرب وقوس

کے آفتاب یعنی نومبر دسمبر میں قصد تو کروں گا۔ کاش لوہارو کی جگہ گوڑ گانو ہوتا یا بادشاہ پور ہوتا۔ کہو گے کہ رام پور کیا نزدیک ہے؟ وہاں گئے کو دو برس ہو گئے۔ یہاں انحطاط و اضمحلال روز افزوں۔ نہ تم یہاں آسکتے ہو، نہ مجھ میں وہاں آنے کا دم۔ بس اگر نومبر دسمبر میں میرا اخیر حملہ چل گیا۔ بہتر، ورنہ

اے وائے ز محرومی دیدار و دگر ہیچ

چہار شنبہ ۲۵ ستمبر ۱۸۶۱ء ہنگام نیمروز غالب

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

(۱۱)

صاحب! آگ برستی ہے، کیونکر آگ میں گر پڑوں؟ مہینا ڈیڑھ مہینا اور چپکے رہو۔ دیو و بہمن بہت دور ہے آبان و

دل ہی تو ہے سیاست درباں سے ڈر گیا
میں اور جاؤں در سے تری بن صدا کیے
بے صرفہ ہی گزرتی ہے، ہو گرچہ عمر خضر
حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کیے
مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گرا نما یہ کیا کیے؟

۱، گاؤ شنگ ہندی میں "آر" کو کہتے ہیں۔ یعنی بیلوں کے ہانکنے کی لکڑی کے سرے پر جو لوہے کی سوئی سی لگا لیتے ہیں۔ سوئی بیلوں کو چھوئی جائے تو وہ تیز چلتے ہیں۔ یعنی سرکار رام پور ۳، امین الدین احمد خاں والد علائی ۴، اصل خط میں تاریخ پہلے مرقوم تھی، لیکن میں نے اسے خط کے نیچے درج کیا تا کہ ترتیب میں یکسانی قائم رہے

آذر میں بہ شرط قصد کروں گا۔ یہ چند اوراق یوسف مرزا نے ازرو دہلی اردو اخبار کا تب سے لکھوا رکھے تھے اور میرے پاس پڑے تھے۔ ثاقب کو دے دیے تا کہ کسی آدمی کے ہاتھ میں تم کو بھیج دے اور تم میری طرف سے میرے بھائی

اور اپنے والد ماجد کو دو۔ جب اٹھا کر دیکھا کریں گے تو کئی منٹ کی دل لگی کو یہ اشعار مکتفی ہو جائیں گے۔ یہ سطریں جواب میں اس خط کا۔ جو آج اس وقت ڈاک سے میں نے پایا ہے۔

نیم روز دوشنبہ

۴، ربیع الاول ۱۲۷۸ء

مطابق ۳۰ ستمبر ۱۸۶۱ء

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

میری جان، کیا کہتے ہو، ہوا ٹھنڈی ہوگئی۔ پانی ٹھنڈا ہوگیا۔ فصل اچھی ہوگئی۔ اناج بہت پیدا ہوگیا۔ توقیع جانشینی مجھ سے تم کو پہنچا۔ خرقہ پایا۔ سجہ وسجادہ کا یہاں پتا نہ ہے ورنہ وہ بھی عزیز نہ رکھتا۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ بھائی نے شفا پائی۔ استاد میر جان پہنچ گئے۔ آخر اکتوبر میں یا آغاز میں نیر رخشاں کو بھی وہیں لو۔ پھر عقرب و قوس کے آفتاب کا کیا ذکر؟ آبان ماہ وآذر ماہ سے کیا غرض؟

لبے	تیر	و	دے	ماہ	واردی بہشت
برآیدہ	ماخاک	با	شیم	و	خشت

استاد میر جان کو۔ اس راہ کہ میری پھوپھی ان کی چچی تھیں اور یہ مجھ سے عمر میں چھوٹے ہیں۔ دعا اور اس رو سے کہ دوست ہیں اور دوستی میں کمی وبیشی سن وسال کی رعایت نہیں کرتے۔ سلام اور اس سبب سے کہ استاد کہلاتے ہیں۔ بندگی اور اس نظر سے کہ یہ سید ہیں درود اور موافق مضمون اس مصرع کے:

سوے اللہ واللہ، مافی الوجود

حضرت تجو وہ شرف نامہ نہیں ہے، کسی احمق نے شرف نامہ میں سے کچھ بغاوت اکثر غلط کمتر صحیح چن کر جمع کیے ہیں۔ نہ دیباچہ ہے کہ اس سے جامع کا حال معلوم ہو۔ نہ خاتمہ ہے کہ عہد وعصر کا حال کھلے۔ ہاں ہمہ میاں ضیاء الدین کے پاس ہے۔ اگر وہ آجائیں گے تو ان کہہ دوں گا۔ اگر وہ لائیں تے تو ان کی قیمت دے کر علائی مولائی کو بھیج دونگا۔

خصی بکروں کے گوشت کے قلیے، دو پیازے، پلاؤ، کباب جو کچھ تم کھا رہے ہو مجھ کو خدا کی قسم اگر اس کا خیال بھی آتا ہو۔ خدا کرے بیکانیر کی مصری کا ٹکڑا تم کو میسر نہ آیا ہو۔ کبھی یہ تصور کرتا ہوں کہ میر جان صاحب اس مصری کے ٹکڑے چبا رہے ہوں گے تو یہاں میں رشک سے اپنا کلیجہ چباتے لگتا ہوں۔

شنبہ ۱۵ اکتوبر ۱۸۶۱ء نجات کا طالب، غالب

۱۔ یعنی ادب میں جانشینی کی سند

(۱۳)

مرزا علائی!

پہلے استاد میر جان صاحب کے قہر و غضب سے مجھ کو بچاؤ تا کہ میرے حواس جو منتشر ہو گئے ہیں جمع ہو جائیں۔ میں اپنے کو کسی طرح کے تصور کو مورد نہیں جانتا۔ جھگڑا ان کی طرف سے ہے تم اس کو یوں چکاؤ۔ یعنی اگر انکو صرف آشنائی و ملاقات منظور ہے تو وہ میرے دوست ہیں۔ شفیق ہیں۔ میرا اسلام قبول فرمائیں اور اگر قرابت و رشتہ داری ملحوظ ہے تو وہ میرے بھائی ہیں۔ مگر عمر میں چھوٹے۔ میری دعا قبول فرمائیں۔

صاحبین ا۔کی رائے کا اختلاف مشہور ہے۔ مجھ سے کچھ نہیں ہوسکتا۔ مگر ہر ایک قول جدا جدا لکھوں۔ آج نہ لکھا نہ سہی۔ دو چار ان کے بعد لکھوں گا۔ تم سمجھ تو گئے ہو گے کہ صاحبین مرزا قربان علی بیگ اور مرزا شمشاد علی بیگ ہیں۔

بھائی صاحب کی رضا جوئی مجھ کو منظور اور یہ غزل معروض ہے میری طرف سے سلام کہو،

از من غزلے گیر و دلفریب ماے کہ مطرب
در نے دمداز روے نوازش دو سہ دم را

غزل

جز دفع غم زیادہ نبو داست کام ما
گوئی چراغ روز سیاہست جام ما

در خلوتش گزر نبود باد را مگر
صر صر بخاک راہ رساند پیام ما

اے باد صبح، عطرے ازاں پیرہن بیار
تسکین زبوے گل نہ پذیر و مشام ما

ہر بار دانہ بہر ہما افگنیم و مور
آید بدام و دانہ رباید ز ام ما

گفتی چو حال دل شنوو، مہرباں شود
مشکل کہ پیش دوست تواں برنام ما

از ما بما پیام و ہم ازما بما سلام
رنج و لے مباد پیام و سلام ما

مقصود ما زدہر آئینہ نیستی ست
یارب کہ ہیچ دوست مباد بکام ما

غالب بقول حضرتِ حافظ ز فیض عشق
ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

(۱۴)

آج جس وقت کہ روٹی کھانے کو گھر جاتا تھا۔ شہاب الدین خاں تمہارا اور مصری کی ٹھلیا لے کر آئے، میں اس کو لوا کر گھر گیا۔ اپنے سامنے مصری تلوائی۔ آدھ پاؤ اوپر دو سیر نکلی۔ خانہ دولت آباد، یہی کافی دوائی ہے اور اب حاجب نہیں۔ رو کھا کر باہر آیا۔ تمہارے ابن عم کا آدمی جواب خط کا متقاضی ہوا کہ شتر سوار جانے والا ہے۔ میں کھانا کھا کر لیٹنے کا عادی ہوں۔

لیٹے لیٹے مصری کی رسید لکھ دی۔ مطالب مندرجہ خط کا جواب کل دوں گا۔

چارشنبہ سہ شنبہ دوازدہم نومبر ۱۸۶۱ء

غالب

(۱۵)

صاحب!

صبح جمعہ کو میں نے تم کو خط لکھا۔اسی وقت بھیج دیا۔پہر دن چڑھے سنا کہ شب کو پر دورہ ہوا۔گیا خود ان سے حال پوچھا۔محمد علی بیگ کی زبانی یہ معلوم ہوا کہ بہ نسبت دورہ ہائے سابق خفیف تھا اور افاقہ جلد ہو گیا۔کل مرزا شمشاد علی بیگ ناقل تھے کہ مجھ سے علی حسین کہتے تھے کہ نواب صاحب فرماتے ہیں کہ لوہارو چلو گے اور ہماری دال روٹی قبول کرو گے؟ میں نے کہا کہ میں دال روٹی چاہتا ہوں مگر پیٹ بھر کے، غالب کہتا ہے کہ اس بیان سے یہ معلوم ہوا کہ سالک کے سلوک منظور نہیں، تنہا ہوائے شمشاد در سر است:

رموز مملکت خویش خسرواں دانند

گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

یک شنبہ یکم فروری ۱۸۶۲ء

نیر اصغر سپہر سخن سرائی۔مولانا علائی کے خاطر نشان و دل نشین ہو کہ آج صبح کوئی پانچ چھ گھڑی دن چڑھے دونوں بھائی صاحب تشریف لائے۔ میں گیا اور ملا علی حسین خاں کو بھی دیکھا۔تھوڑی دیر کے بعد بھائی صاحب والدہ صاحبہ کے پاس گئے۔ میں گھر آیا۔کھانا کھایا۔دوپہر کو تمہارا خط پایا۔دو گھڑی لوٹ پوٹ کر جواب لکھا اور ڈاک میں بھجوایا۔

یہ مرض جو بھائی کو ہے اس راہ سے کہ ضد صحت ہے۔مکروہ طبع ہے، ورنہ ہرگز موجب خوف و نظر نہیں۔ میں تو بھول گیا تھا۔اب بھائی کے بیان سے یاد آ گیا کہ بارہ تیرہ برس پہلے ایک دن ناگاہ یہ حالت طاری ہو گئی تھی۔وہ موسم جوانی کا تھا اور حضرت عادی بہ افیون نہ تھے۔تنقیہ بہ تے فوراً اور بہ اسہال چند روز بعد عمل میں آیا۔اب سن کہولت، استعمال افیون مزید علیہ، دورہ جلد جلد متواتر ہوا۔اضطراب از راہ محبت ہے از روے حکمت اضطراب کی کوئی وجہ نہیں۔نظیری میں یکتا حکیم امام الدین خاں،

۱قربان علی بیگ سالک جو شمشاد علی بیگ رضوان کے بھائی تھے۔مطلب یہ کہ تو اب صرف شمشاد علی بیگ کو ساتھ لے جا رہے تھے۔اور قربان علی بیگ سے سلوک کے لیے تیار نہ تھے۔منشی مہیش پرشاد نے لکھا ہے کہ تنہا ہوا ے شمشاد دوسرا است کے کچھ معنی نہیں بنتے۔لیکن معنی بالکل ظاہر ہیں۔سالک سے سلوک منظور

نہیں، صرف شمشاد کی شوق سر میں ہے۔ یعنی سالک کو اپنے پاس رکھنے کے لیے تیار نہیں صرف شمشاد کو رکھنے پر آمادہ ہیں۔ ہوا کا لفظ شمشاد کی مناسبت سے لائے ہیں۔ اس خط میں نواب امین الدین احمد خاں کی بیماری کا ذکر ہے۔ ۲۔ نیر اصغر کو اس لیے کہا کہ ضیاء الدین احمد خاں نیر سے چھوٹے بھائی اور غالب کے خلیفہ ثانی۔

۳۔ نظری کا مطلب ہے کہ علم طب میں۔

وہ ٹونک عملی میں چالاک حکیم احسن اللہ خاں، وہ کرولی رہے حکیم محمود خاں، وہ ہمسایہ دیوار بہ دیوار حکیم غلام نجف خاں وہ دوست قدیم صادق الولا حکیم بقا کے خاندان میں دو صاحب موجود۔ تیسرے حکیم منجھلے وہ بھی شریک ہو جائیں گے۔ اب آپ فرمائیے حکیم کون ہے؟ ہاں دو ایک ڈاکٹر باعتبار ہم قومی حکام نامور یا کوئی ایک آدھ بید، سو منزوی اور گمنام بہر حال خاطر جمع رکھو۔ خدا کے فضل پر نظر رکھو۔

سبحان اللہ، تم مجھ سے سپارش کرو امین الدین خاں کی، کیا میرے پہلو میں دل یا میرے دل میں ایمان، جس کو محبت بھی کہتے ہیں۔ بقدر پر پشہ و سر مو ر بھی نہیں؟ معالجہ حکماء کی راہ پر رہے گا۔ ندیمی اور غمخواری میں اگر قصور کروں تو گنہ گار، میں ایسے موقع میں رائے اطبا میں خلاف کم واقع ہوتا ہے۔ مرض مشخص، دوا معین، سوء مزاج ساذج نہیں، مادی ہے اور مادہ بارو ہے۔ کوئی طبیب سوائے تنقیہ کے کچھ تدبیر نہ سوچے گا۔ تنقیہ میں سوائے مخرجات بلغم اور کچھ تجویز نہ کرے گا تجویز ہے کہ دو دن کے بعد تنقیہ خاص ہو اور ایارج کا مسہل دیا جائے۔ اسماء آیات شفا بخش مقرر رہیں۔ رد سحر و دفع بلا، ان کے ذریعے سے متصور ہے۔ مگر ان ملاؤں اور عزائم

خوانوں نے تہ توڑ دی ہے۔ کچھ نہیں جانتے اور باتیں بکھانتے ہیں۔ تمہارے باپ پر کوئی سحر کیوں کرے گا۔ بے چارہ الگ ایک ایسے گوشہ رہتا ہے کہ جب تک خاص وہاں کا قصد نہ کرے۔ کبھی کوئی وہاں نہ جائے۔ یہ خیال ہے عبث، ہاں خیرات اور مساکین سے طلب دعا اور اہل اللہ سے استمداد، شہر میں مساکین شمار سے باہر، اہل اللہ ایک حافظ عبدالعزیز، ما بہ خیر شما بسلامت۔

۱۵ شعبان ۱۲۷۸ھ فروری ۱۸۶۲ء وقت نماز ظہر نجات کا

طالب، غالب

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

(۱۷)

صاحب!

کل تمہارے خط کا جواب بھیج چکا ہوں۔ آج صبح کو بھائی صاحب کے پاس گیا۔ بھائی ضیاء الدین خاں اور بھائی شہاب الدین بھی وہیں تھے۔ مولوی صدر الدین میرے سامنے آئے۔ حکیم محمود خاں کے طور پر معالجہ قرار پایا ہے۔ یعنی انھوں نے نسخہ لکھ دیا ہے۔ سو اس کے موافق جبوب بن گئی ہیں۔ نقوع کی دوائیں آج آ کر بھیگیں گی۔ کل جبوب کے اوپر وہ نقوع پیا جائیگا مگر انداز وادا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی حضرت مریض کی اوران کے ہواخواہوں کی رائے میں

۱، عملی میں مراد علاج معالجہ ہیں۔ حکیم امام الدین خاں اور حکیم احسن اللہ خاں دہلی کے مشہور طبیب تھے۔ اول الذکر غدر کے بعد ٹونک چلے گئے اور بڑے بڑے والیان ریاست کے معالج رہے۔ حکیم احسن اللہ خاں ریاست کرولی میں ملازم ہو گئے تھے بڑوہ میں وفات پائی۔ ۳، حکیم محمود خاں شریف خانی والد مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم ۴، بقا کا خاندان بہت مشہور تھا۔ منجھلے صاحب کا نام حکیم حسام الدین تھا۔ ۵، انگریز ۶، گوشہ نشیں ۷، خرابی مزاج سادہ نہیں۔ اس میں مادہ جمع ہو گیا ہے جو بارد ہے۔ ۸، ایک دوائے مسہل جس سے دماغ کا تنقیہ ہوتا ہے۔ ۹، یعنی وہ آیتیں یا اوروجو شفا مرض یا ردسحر یا دفع بلا کے لیے پڑھے جاتے ہیں۔ ۱۰، مفتی صدر الدین خاں آزردہ جو غدر سے پہلے صدر الصدور تھے۔ ۱۱، گولیاں ۱۲، دو دوائیں جو

بھگو کر پلائی جاتی ہیں۔

۱،عملی سے مراد ہے علاج معالجہ میں۔۲،حکیم امام الدین اور حکیم احسن اللہ خاں دہلی کے مشہور طبیب تھے۔اول الذکر غدر کے بعد ٹونک چلے گئے اور بڑے بڑے والیان ریاست کے معالج رہے۔حکیم احسن اللہ خاں ریاست کرولی میں ملازم ہو گئے تھے بڑودہ میں وفات پائی ۳،حکیم محمود خاں شریف خانی والد مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم ۴، بقا کا خاندان اطبا بہت مشہور تھا۔منجھلے صاحب کا نام حکیم حسام الدین تھا۔۵ ،انگریز ۶، گوشہ نشین ۷، خرابی مزاج سادہ نہیں۔اس میں مادہ جمع ہو گیا ہے جو بارد ہے۔۸، ایک دوائے مسہل جس سے دماغ کا تنقیہ ہوتا ہے۔۹، یعنی وہ آیتیں یا اور جو شفا مرض یا رو سحر یا دفع بلا کے لیے پڑھے جاتے ہیں۔۱۰، مفتی صدرالدین خاں آرزو جو غدر سے پہلے صدر الصدر تھے۔۱۱، گولیاں ۱۲، وہ دوائیں جو بھگو کر پلائی جاتی ہیں۔

قصد اس استعلاج کا مذبذب ہے۔نسخے کی حقیقت کو میزان نظر میں تول رہے ہیں۔استاد میر جان بھی تھے۔نیم نامعقول مرزا اسد بیگ بھی تھے۔سب طرح خیریت ہے۔

کل تمہارے خط میں دوبارہ یہ کلمہ مرقوم دیکھا کہ دلی بڑا شہر ہے۔ہر قسم کے آدمی وہاں بہت ہونگے۔اے میری جان! یہ وہ دلی نہیں ہے جس میں تم پیدا ہوئے ہو۔وہ دلی نہیں ہے جس میں تم نے علم تحصیل کیا۔وہ دلی نہیں ہے جس میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آیا کرتے تھے۔وہ دلی نہیں جس میں

اکیاون برس سے مقیم ہوں۔ ایک کمپ ۳ ہے۔ مسلمان اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ۔ باقی سراسر ہنود، معزول بادشاہ کے ذکور، جو بقیہ السیف میں وہ پانچ پانچ روپے مہینا پاتے ہیں۔ اناث میں سے جو پیر زن ہے کٹنیاں اور جو جوان ہیں کسبیاں۔ امرائے اسلام میں سے اموات گنو۔ حسن علی خاں بہت بڑے باپ کا بیٹا، سو روپے روز کا پنسن دار، سو روپے مہینا کا روزینہ خوار بن کر نامرادانہ مر گیا۔ میر نصیر الدین باپ کی طرف سے پیر زادہ، نانا اور نانی کیطرف سے امیر زادہ۔ مظلوم مارا گیا۔ آغا سلطان، بخشی محمد خان کا بیٹا۔ جو خود بھی بخشی ہو چکا ہے۔ بیمار پڑا۔ نہ دوا نہ غذا انجام کر مر گیا۔ تمہارے چچا کی سرکار سے تجہیز و تکفین ہوئی۔ احبا کو پوچھو۔ ناظر حسین مرزا۔ جس کا بڑا بھائی مقتولوں میں آیا۔ اس کے پاس ایک پیسہ نہیں۔ ٹکے کی آمد نہیں۔ مکان اگرچہ رہنے کو مل گیا ہے۔ مگر دیکھیے کہ چھٹا رہے یا ضبط ہو جائے۔ بڈھے صاحب ساری املاک بیچ کر نوش جان کر کے، بیک بینی و دو گوش بھرت پور چلے گئے۔ ضیاء الدولہ کی پانسو روپے کرایے کی املاک واگزاشت ہو کر پھر قرق ہوگئی۔ تباہ خراب لاہور گیا۔ وہاں پڑا ہوا ہے۔ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ قصہ کوتاہ قلعہ اور جھجرا اور بہادر گڑھ اور بلب گڈھ اور فرخ نگر کم و بیش تیس لاکھ روپے کی ریاستیں مٹ گئیں۔ ہنر مند آدمی یہاں کیوں پایا جائے؟ جو حکماء کا حال لکھا ہے، وہ بیان واقع ہے۔ صلحا اور زہاد کے باب میں جو حرف مختصر میں نے لکھا ہے۔ اس کو بھی جانو۔ اپنے والد ماجد کی طرف سے خاطر جمع رکھو۔ سحر۔ آسیب کا گمان ہرگز کرو۔ خدا چاہے تو استعمال ایارجات کے بعد بالکل اچھے ہو جائیں گے اور اب بھی خدا کے فضل سے اچھے ہیں۔

یک شنبہ ۱۶ فروری ۱۸۶۲ء   عافیت کا طالب۔ غالب

۱، یعنی علاج کا ارادہ پختہ نہیں ہوا۔ ۲، یعنی چھاؤنی، معسکر۔ ۳، بہادر شاہ ثانی ۴، نجابت علی خاں والی جھجر کا چھوٹا بیٹا۔ بڑے بھائی فیض محمد خاں کے عہد حکومت میں فوج کے سپہ سالار رہا۔ جب فیض علی خاں مسند پر بیٹھا تو اختلاف پیدا ہو گیا۔ مقدمے تک نوبت پہنچ۔ آخر سرکار انگلشیہ نے صلح کرائی۔ ۳ ہزار روپے پنسن لے کر دہلی میں اقامت اختیار کر لی۔ غدر کے دنوں میں باہر نکل گیا تھا۔ جنوری ۱۸۵۹ء میں واپس آیا۔ غالب کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۸۶۲ء میں فوت ہوا۔ اسوقت تک صرف سو روپے ماہوار ملتے تھے۔ ۵، شیخ نصیر الدین عرف کالے میاں۔ یہ خواجہ فخر عالم کے پوتے اور شیخ نظام الدین کے فرزند تھے۔ ان کی والدہ دہلی کے کسی امیر خاندان سے تھی۔ اسی لیے نانا نانی کو امراء میں گنا ۶، بخشیوں کا خاندان بھی بہت مشہور اور بلند مزلت تھا۔ ۷، ناظر حسین میرزا کا نام اور پورا لقب معین الدولہ، عمدہ الامراء صفدر الملک ذوالفقار الدین حیدر نظامت خاں بہادر ذوالفقار جنگ تھا اور بڑے بھائی کا نام مظفر الدولہ سیف الدین حیدر خاں، دونوں حسام الدین حیدر خاں کے فرزند تھے۔ مظفر الدولہ مارے گئے۔ ناظر حسین مدت تک پریشان حال پھرتے رہے۔ ۸، بڈھے صاحب کا نام نواب غلام محی الدین تھا۔ روسا دہلی میں سے تھے۔ ایک ہزار پنشن تھی۔ تین سو روپے ماہوار بھرت پور سے ملتے تھے، پانسو ماہانہ کرایہ آتا تھا۔ ۹، دکن الدولہ کے بیٹے تھے۔ غدر کے بعد پانی پت چلے گئے اور پکڑے گئے۔

(۱۸)

صاحب!

پرسوں تمہارا خط آیا۔ کل جمعہ کے دن نواب کا مسہل تھا۔ گیارہ بجے وہاں سے آیا چونکہ حبوب میں مکرب ادوائیں تھیں۔ بہت بے چین رہے۔ آٹھ دس دست آئے۔ آ کر روز مزاج بحال ہو گیا۔ تنقیہ اچھا ہوا۔ اب بفضل الٰہی اچھے ہیں اور یقین ہے کہ مرض عود نہ کرے۔ ولی کی اقامت کی مدت اپنے والد کی رائے پر رہنے دو۔ بقدر مناسبت وقت عزم، خیر خواہانہ کچھ کہوں گا ضرور۔ نہ یہ ابراہم، میں تم سے زیادہ ان کا مزاج داں ہوں۔ یہ خود پسند اور معہذا اپارش کا دشمن ہے۔ مغلچوں کے مقدمے کو طبیعت امکان پر چھوڑ دو۔ میں دخل نہ کروں گا۔ ہاں اگر خود مجھ سے پوچھیں گے یا میرے سامنے ذکر آ جائے گا تو میں اچھی طرح کہوں گا۔

بریدہ باد زبانے کہ ناسزا گوید

برا نہ ماننا۔ اگر یہ دونوں بھائی یا ان میں سے ایک رفیق ہو گیا۔ یوں تمام عمر بخوشی گزر جائے۔ لیکن تم کے برس کے مہینے کے ہفتے کا اگریمنٹ لکھتے ہو؟

صبح یک شنبہ یکم مارچ ۱۸۶۲ء غالب

صاحب!

میرا برادر عالی قدر اور تمہارا والد ماجد اب اچھا ہے۔ ازروے عقل اعادہ مرض کا احتمال باقی نہیں ہے۔ رہا وہم، اس کی دوا لقمان کے پاس بھی نہیں۔ مرزا قربان علی بیگ اور مرزا شمشاد علی بیگ کے باپ میں جو کچھ تم نے لکھا ہے۔ اور آئندہ جو کچھ لکھو گے، میری طرف سے جواب وہی ہوگا، جو آگے لکھ چکا ہوں یعنی میں تماشائی محض رہوں گا۔ اگر بھائی صاحب مجھ سے کچھ ذکر کریں گے تو بھلی کہونگا۔

آپ کے عم عالی مقدار جو فرماتے ہیں کہ غالب کو بیٹھے ہوئے ہزارہا تسویلات وخیالات دکھلائی دیتے ہیں۔ یہ حضرت نے اپنی ذات پر میری طبیعت کو طرح کیا ہے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح میں مبتلائے وساوس واوہام ہوں اور لوگ بھی اسی طرح بخارات مراقی میں گرفتار ہوں گے۔ قیاس مع الفاروق ہے نہ تخیل صادق۔ یہاں لا موجود الا اللہ کے بادہ ناب کا رطل گراں چڑھائے ہوئے اور کفرو اسلام ونور ونار کو مٹائے ہوئے بیٹھے ہیں:

کجا غیر کو غیرو کو نقش غیر
سوائے اللہ واللہ مافی الوجود

ضیر ان بروزن ذی گران لغت عربی ہے نہ معرب میں کہہ نہیں سکتا کہ یہ پھول ہندوستان میں ہوتا ہے یا نہیں۔ اس کی تحقیقات ازروئے الفاظ الادویہ ممکن ہے۔

آج اس نے جلاب لیا۔ دست آئے۔ مواد خوب اخراج ہوا۔

فارسی غیر فصیح۔ امروز فلانے سہل گرفت۔ دو دست آمدند۔ مواد خوب بر آمد۔

فارسی فصیح: امروز فلانے پگاہ، وارد ے مسہل آشامید، تا شام وہ بار نشست یادہ بار بہ مستراح یا وہ بار بہ بیت الخلاء رفت، مادہ فاسد چنانکہ باید۔ اخراج یافت۔

معلوم رہے کہ لوطیوں کے منطق میں خصوصاً اور اہل پارس کے روزمرہ میں عموماً نشستن، استعارہ ہے ریدن کا چنانچہ ایک تذکرہ میں مرقوم ہے کہ اصفہان میں ایک امیر نے شعراء کی دعوت اپنے باغ میں کی۔ مرزا صائب اور اس کے ہم عصر کئی شعرا جمع ہوئے۔ ایک شاعر کہ تذکرہ میں اس کا نام مندرج ہے اور میں بھول گیا ہوں۔ اکول تھا اور معدہ اس کا ضعیف تھا حرص وشرہ کے سبب سے بہت کھا جاتا تھا۔ ہضم نہ کرسکتا تھا۔ کھانا کھا کر شراب پی کر دروازہ باغ کا مقفل کر کے سب سو رہے۔ اس مرد کول فضول نے رات بھر میں سارا باغ ہگ بھرا۔ نہ ایک جگہ، بلکہ کبھی اس کیاری میں اور کبھی اس روش پر، کبھی اس درخت کے تلے، کبھی اس دیوار کی جڑ میں۔ قصہ مختصر غایت شرم و حیا سے دو چار گھڑی رات رہے دیوار سے کود کر چلا گیا۔ صبح کو جب جاگے، اس کو ادھر ادھر ڈھونڈا کہیں نہ پایا۔ مگر حضرت کا فضلہ کئی جگہ نظر آیا۔ مرزا صائب نے ہنس کر فرمایا۔

''یاراں شمارا چہ افتادہ است کہ مے گوئید فلانے در باغ نیست؟
می بینم کہ مخدوم ہم دریں باغ چند جانشستہ است''

صبح جمعہ ۵ رمضان و ۷ مارچ سال رستاخیز۔

رباعی خط میں لکھنا بھول گیا۔ یہ میں نے بھائی کو تہنیت میں بھیجی تھی:

اے کردہ بہ مہر زر فشانی تعلیم
پیداز کلاہ تو شکوہ و تیہیم
یاوا بتو فرخندہ ز یزدان کریم
پروانگی جدید اقطاع قدیم

۵ رمضان ۱۲۷۸ھ، ۷ مارچ ۱۸۶۲ء

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

یار جھتیجے۔ گویا بھائی ہمولانا علائی، خدا کی دہائی، نہ میں ویسا ہوں گا جیسا غیر سمجھا اور تم مجھ کو لکھ چکے ہو یعنی خفقانی اور خیال تراش نہ ویسا ہوں گا جیسا میرزا علی حسین خاں بہادر سمجھے ہوں گے:

اے کاش کسے ہر آنچہ ہستم، داند

دو جانہ میں میرا انتظار اور میرے آنے کا تقریب شادی پر مدار، یہ بھی شعبہ ہے انھیں ظنون کا، جن سے تمہارے چچا کو گمان ہے مجھ پر جنون کا۔ جا گیر دار میں نہ تھا کہ ایک جا گیر دار مجھ کو بلاتا۔ گویا میں نہ تھا کہ اپنا ساز و سامان لے کر چلا جاتا۔ دوجانہ جا کر شادی کماؤں اور پھر اس فصل میں کہ دنیا کرہ نار ہو۔ لوہارو بھائی کے دیکھے کو نہ جاؤں اور پھر اس موسم میں کہ جاڑے

ا، بہت کھانے والے ۲،حرص، لالچ

کی گرمی بازار ہو؟

کی گرمی بازار ہو؟

کل استاد میر جان صاحب نے تمہارا خط مجھ کو دکھایا ہے۔ میں نے ان کو جانے نہ جانے میں متردد پایا ہے۔ جائیں، نہ جائیں۔ میں اپنی طرف سے ترغیب کرتا رہتا ہوں اور کہتا ہوں اور کہتا رہوں گا۔ غلام حسین خاں اگر کسی وقت آ جائیں گے تو ان کو تمہاری تحریکات کا خلاصہ خاطر نشان کر دوں گا۔ حق سبحانہ تعالیٰ ان دونوں

صاحبوں کو ایک کو ان میں سے توفیق دے یا مجھ کو طاقت یا تم کو انصاف کہ میرے نہ آنے کو دلی کی دل بستگی پر محمول نہ کرو۔ مجھ کو رشک ہے جزیرہ نشینوں کے حال پر اور رئیس فرخ آباد پر خصوصاً کہ جہاز سے اتار کر سرزمین عرب میں چھوڑ دیا۔ ہاہا ہاہا۔

پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار
اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

کلیات ۴، کے انطباع کا اختتام اپنی زیست میں مجھ کو نظر نہیں آتا۔ قاطع برہان ۵، کا چھاپا تمام ہو گیا۔ حق التصنیف کی ایک جلد میرے پاس آ گئی۔ وہ تمہارے غم نامدار کی نظر ہوئی۔ باقی جلدیں جن کا میں خریدار ہوا ہوں۔ اور درخواست میری مطبع میں داخل ہے۔ جب تک قیمت نہ بھیج دوں۔ کیونکر آئیں۔ روپے کی تدبیر میں ہوں۔ اگر بہم پہنچ جائے تو بھیج دوں۔ تمہارے پاس جو قاطع برہان پہنچی ہے۔ اگر چھاپے کی ہے تو صحیح ہے۔ جہاں تردد ہو غلط نامہ ملحقہ میں دیکھ لو۔ زیادہ انکشاف منظور ہو۔ مجھ سے پوچھ لو۔ اگر قلمی ہے تو درجہ اعتبار سے ساقط ہے۔ اس کو میری تالیف نہ سمجھو۔ بلکہ مجھ کو مول لے لو اور اس کو پھاڑ ڈالو۔ آج یوم الخمس ۱۹ جون المبارک، بارہ پر تین بجے تمہارا خط آیا۔ ادھر پڑھا ادھر جواب لکھنے بیٹھا۔ یہاں تک لکھ چکا تھا کہ شیخ شہاب الدین سہروردی آئے، تمہارا خط ان کو دیا۔ وہ پڑھ رہے ہیں، ہم لکھ رہے ہیں۔ ہوا سرد چل رہی ہے۔

۱۹ جون ۱۸۶۲ء

جان غالب!

وہ خط متواتر تمہارے پہنچے ہمغربی عرفا میں سے ہے بیشتر اس کے کلام میں مضامین حقیقت آ گئیں ہیں۔ لیکن، واماں گلہ دارد، اس زمین میں میں نے اسکی غزل نہیں دیکھی۔ حاجی محمد جان قدسی کی غزل اس زمین میں ہے:

در بزم وصال تو بہ ہنگام تماشا
نظارہ زجنبیدن مژگان گلہ دارد

یہ ایک شعر اس کا مجھے یاد ہے۔ بھائی تمہارا باپ بدگمان ہے یعنی مجھ کو زندہ سمجھتا ہے۔ میرا اسلام کہو اور

۱، غلام حسن خاں محو پسر حسین خاں مسرور والد عارف ۔ یہ عارف کے علاتی بھائی تھے یعنی دوسری والدہ سے ۔۲، وہ لوگ جنہیں غدر میں حصہ لینے کی بناء پر انڈمان بھیجا گیا تھا۔۳، تفضّل حسین خاں رئیس فرخ آباد جن پر غدر میں شرکت کا الزام لگا تھا اور خود ان کی خواہش پر انہیں عرب بھیج دیا گیا تھا مکہ معظمہ میں ان کی وفات ہوئی۔۴، کلیات نظم فارسی جو نولکشور کے مطبع میں چھپ رہی تھی، پھر درفش کا ویانی، کے نام سے بعض فوائد کے اضافے کے ساتھ اسے ۱۸۶۵ء میں چھاپا گیا ہے۔۶، شہاب الدین خاں ثاقب جنہیں مشہور شیخ طریقت سے اشتراک اسم کے باعث، سہروردی کہا۔۷، فارسی کا ایک شاعر ۸، فارسی کا ایک شاعر

یہ شعر میرا پڑھ کر سناؤ۔

گمان زیست بود منت ز بے بے دردی

بداست مرگے و لے بدتر از گمان تو نیست

مجھے کافور وکفن کی فکر پڑ رہی ہے۔وہ ستم گر شعر وسخن کا طالب ہے۔زندہ ہوتا تو وہیں کیوں نہ چلا آتا، مجھ پر سے یہ تکلیف اٹھوالو اور تم اس زمین میں چند شعر لکھ کر بھیج دو۔ میں اصلاح دیکر بھیج دوں گا۔عصائے۔پیر بجائے پیر۔واللہ میرا کلام ہندی یا فارسی کچھ میرے پاس نہیں ہے۔آگے جو کچھ حافظہ میں موجود تھا وہ لکھ بھیجا۔اب جو کچھ یاد آ گیا۔وہ لکھتا ہوں۔

غزل

بامن که عاشقم سخن از ننگ و نام چیست
د امر خاص حجت دستور عام چیست؟
مستم خون دل که دو چشم ازاں پر است
گوئی مخور شراب و نه بینی بجام چیست؟
باه و دست هر که باده بخلوت خرد مدام[
واند که حورو کوثر و دارلسلام چیست؟
ازکاسه کرام نصیب است خاک را
تا از فلک نصیبه کاس کرام چیست؟
غالب اگ ر نه خرقه و مصحف بهم فروخت
پر سدا بچرا که زرخ مے لعل فام چیست؟

دل برو حق آن است که دلبر نتواں گفت
بیدا دتواں دیده ستمگر نتواں گفت
ورز مگهش تا چخ و خنجر نتواں برو
وریز مگهش باده ساغر نتواں گفت
زخشندگی ساعدو گردن نتواں جست
زینگمدگی پاره و پر گر نتواں گفت

پیوستہ دہد بادہ و ساقی نتواں خواند
ہموارہ تراشد بت و آزر نتواں گفت

۱،کلیات میں اس غزل کے دس شعر ہیں نیز چوتھے شعر میں ما خستہ کی جگہ دل خستہ ہے؛باقی ذیل میں درج ہیں:

در روز تیرہ از شب تارم نہ ماند بیم
چوں صبح نیست خود چہ شناسم کہ شام چیست؟
با خیل مورمے رسی از ر خوش است فال
قاصد بگو کزآں لب خوشیں پیام چیست
گفتی قفس خوش است، تواں بال و پرکشود
بارے علاج خستگی بند دام چیست؟
نیکی زیست ، از تو نخواہیم مزد کار
در خود بدیم کار توایم، انتقام چیست؟

اس خط پر کوئی تاریخ ثبت نہیں لیکن قرینہ یہی ہے کہ یہ ۱۸۶۲ء کا ہے۔اس لیے کہ کلیات چھپنے سے پہلے کا معلوم ہوتا ہے۔اور اس کے بعد کے خط میں گلہ دارد والے شعر کا حوالہ ہے۔وہ جولائی ۱۸۶۲ء میں لکھا گیا تھا۔

ورگرم روی سایہ و سر چشمہ نہ جوئیم
باما سخن ا زطوبی و کوثر نتواں گفت
ہنگامہ سر آمد چہ زنی دم ز تظلم

گر خود ستمے رفت بہ محشر نتواں گفت

آں راز در سینہ نہاں است ہ وعظ است

بر وار تواں گفت و بہ منبر نتواں گفت

کارے عجب افتادہ بدیں شیفتہ ما را

مومن نہ بود غالب و کافر نتواں گفت

کوئی امید بر نہیں آتی

کوئی صورت نظر نہیں آتی

آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی

اب کسی بات پہ نہیں آتی

موت کا ایک دن معین ہے

نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

داغ دل گر نظر نہیں آتا

بو بھی اے چارہ گر نہیں آتی؟

جانتا ہوں ثواب اطاعت و زہد

پر طبیعت ادھر نہیں آتی

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی

کچھ ہماری خبر نہیں آتی

کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالب

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

شرم تم کو مگر نہیں آتی۔

نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات؟ جہاں بات بنائے نہ بنے
میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے حضرت دل
اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے
اس نزاکت کا برا ہو، وہ بھلے ہیں تو کیا
ہاتھ آئے تو انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے
غیر پھرتا ہے ترے خط کو لیے یوں کہ اگر
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے
عشق پر زور نہیں ، ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

لوصاحب، پرسوں تمہارا خط آیا اور کل دوپہر کو استاد میر جان آئے۔ جب ان سے کہا گیا تو جواب پایا کہ میں مدت سے

۱، ایک شعر چھوٹ گیا ۲، تین شعر چھوٹ گئے ۳، تین شعر چھوٹ گئے

آمادہ سفر لوہار بیٹھا ہوں۔ حکیم صاحب کی گاڑی کی روانگی کیوقت میں نے اپنی گٹھری بھیجی تھی۔ وہ پھر آئی۔ اس مراد سے کہ گاڑی میں جگہ نہ گٹھری کی، نہ سواری کی۔ ناچار چپ ہو رہا۔ اب وہ گٹھری ویسی ہی بندھی ہوئی رکھی ہے۔ جب میاں خاں اور وزیر خاں روانہ ہوں گے اور منشی امداد حسین کو اطلاع دیں گے۔ تو میں فورا چلا دوں گا۔ پا بر کاب ہوں۔ کل ہی آخر روز غلام حسن خاں آئے۔ کل انھوں نے چوتھے دن کھانا کھایا تھا۔ ہیضہ ہو گیا تھا۔ قے متواتر، دست پے بہ پے، غرض بچ گئے۔ کہتے تھے کہ آج جولائی کی ۱۷ تاریخ ہے۔ تیرہ دن یہ اور پانچ دن اگست کے اور نہیں جا سکتا۔ تنخواہ لے کر بانٹ بونٹ کر ایک دن ٹھہروں گا۔ لوہارو کی راہ لوں گا۔ مرزا شمشاد علی بیگ سے تمہارا پیام کہا گیا۔ بعید ہے جو غلام حسن خاں کے ہم سفر ہو جائیں۔ بھائی کی طرف سے منشی امداد حسین خاں کو لکھوا بھیجو کہ میاں خاں وغیرہ کیساتھ استاد کو ضرور بھیجنا اور تم اپنی طرف سے اپنے ابن عم غلام حسن کو بحوالہ میری تحریر کے عیادت اور اوائل اگست میں روانگی کی تاکید لکھ بھیجو۔

در بزم وصال ت و بہ ہنگام تماشا

نظارہ ز جنبیدن مژگان گلہ دادر

یہ زمین قدسیؒ کے حصہ میں آ گئی ہے۔ میں اس میں کیوں کہ تخم ریزی کروں اور اگر بے حیائی سے کچھ ہاتھ پاؤں ہلاؤں تو اس شعر کا وجود کہاں سے لاؤں؟

ہر گز نتواں گفت دریں قافیہ اشعار
بیجاست برادر اگر از من گلہ دارد

التواء شرب شراب ۲۲ جون، شروع شراب، جولائی

المنۃ اللہ کہ در میکدہ باز است

جولائی ۱۸۶۲ء غالب

میری جان!

سن۔ پنجشنبہ آٹھ جمعہ نو ہفتہ دس، اتوار گیارہ، ایک مثرہ برہمز دن مہینہ نہیں تھا۔ اس وقت بھی شدت سے برس رہا ہے۔ انگیٹھی میں کوئلے ہکا کر پاس رکھ لیے ہیں۔ دو سطریں لکھیں اور کاغذ کو آگ سے سینک لیا۔ کیا کروں؟ تمہارے خط کا جواب ضرور۔ لو سنتے جاؤ۔ مرزا شمشاد علی بیگ کو تمہارا خط پڑھوا دیا۔ انھوں نے کہا کہ غلام حسن خاں کی معیت پر کیا موقوف ہے۔ مجھے آپ سواری مل جائے۔ کل چل نکلوں۔ اب میں کہتا ہوں کہ اونٹ ٹٹو کا موسم نہیں۔ گاڑی کی تدبیر ہو جائے۔ بس پچاس برس کی بات ہے کہ الٰہی بخش خاں مرحوم نے ایک زمین نئی نکالی۔ میں نے حسب الحکم ایک غزل لکھی، بیت الغزل یہ:

۱، یہاں اور بہ معنی مزید ہے۔ ۲، آٹھ اتفاق سے تمام نسخوں میں حذف ہو گیا۔ غلطی بالکل واضح تھی۔ لیکن کسی کی توجہ تصحیح کی طرف نہ کی گئی ۳، غالب کے خسر الٰہی بخش خاں معروف۔

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے، شراب تو دے

مقطع یہ ہے

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پانو پھول گئے

کہا جو اس نے ذرا میرے پانو داب تو دے

اب میں دیکھتا ہوں کہ مطلع اور چار شعر کسی نے لکھ کر اس منقطع اور اس بیت الغزل کو شامل ان اشعار کر کے غزل بنائی ہے اور اسکو لوگ گاتے پھرتے ہیں۔ مقطع اور ایک شعر میرا اور پانچ شعر کسی الو کے۔ جب شاعر کی زندگی میں گانے والے، شاعر کے کلام کو مسخ کر دیں تو بعید ہے کہ شاعر متوفی کے کلام میں مطربوں نے خلط کر دیا ہو۔ مقطع بے شک مولانا مغربی کا ہے اور شعر جع میں نے تم کو لکھا ہے اور یہ شعر جواب لکھتا ہوں:

داماں نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار
گلچین بہار تو ز داماں گلہ دارد

یہ دونوں شعر قدسی کے ہیں۔ مغربی قدماء میں اور عرفا میں ہے جیسا عراقی۔ ان کا کلام وقائق وحقائق تصوف سے لبریز۔ قدسی شاہجہانی شعراء میں صائب وکلیم کا ہم عصر اور ہم چشم، ان کا کلام شور انگیز۔ ان بزرگوں کی روش میں زمین آسمان کا فرق۔

بھائی صاحب کو سلام کہنا اور کہنا کہ صاحب وہ زمانہ نہیں۔ ادھر متھرا داس سے قرض لیا ادھر دربری مل کو مارا، ادھر خوب چند چین سکھ کی کوٹھی جا لوٹی۔ ہر ایک کے پاس تمسک مہری موجود، شہد لگاؤ، چاٹو۔ نہ مول، نہ سود، اس سے بڑھ کر یہ بات کہ روٹی کا خرچ پھوپی کے سر۔ با ایں ہمہ کبھی خان ا، کچھ دیا دے دیا۔ کبھی الور سے کچھ دلوا دیا، کبھی ماں نے آگرہ۔ سے بھیج دیا۔ اب میں اور باسٹھ روپے آٹھ انے کلکٹری ۲، کے، سو روپے رام پور کے۔ قرض دینے والا ایک میر امختار کار۔ وہ سو ماہ

بماہ لیا چاہے۔ مولی میں قسط اسکو دینی پڑے۔ انکم ٹیکس جد، چوکیدار جد، سود جدا مول جدا بی بی جدا۔ بچے جدا۔ شاگرد پیشہ جدا۔ آمد وہی ایک سو باسٹھ۔ تنگ آ گیا۔ گزارہ مشکل ہوگیا۔۔ روزمرہ کا کام بند رہنے لگا۔ سوچا کہ کیا کروں۔ کہاں سے گنجائش نکالوں، قہر درویش بجان درویش۔ صبح کو تبرید متروک، چاشت کا گوشت آدھا۔ رات کو شراب و گلاب موقوف، بیس بائیس روپے مہینا بچا۔ روزمرہ کا خرچ چلا۔ یاروں نے پوچھا، تبرید و شراب کب تک نہ پیو گے؟ کہا گیا جب تک وہ نہ پلائیں گے۔ پوچھا، نہ پیو گے تو کس طرح جیو گے جواب دیا کہ جس طرح وہ جلائیں گے، بارے مہینا پورا نہیں گزرا تھا کہ رام پور سے علاوہ وجہ مقرری اور روپیہ آ گیا۔ قرض مقسط ادا ہوگیا۔ متفرق۔ خیر رہو۔ صبح کی تبرید۔ رات کی شراب جاری ہوگئی۔ گوشت پورا آنے لگا۔ چونکہ بھائی صاحب نے وجہ موقوفی اور بحالی کی پوچھی تھی۔ انکو یہ عبارت پڑھا دینا اور حمزہ خاں کو بعد سلام کہنا:

۱، خان سے مراد بظاہر احمد بخش خاں مرحوم ہیں۔ جو الٰہی بخش خاں معروف کے بڑے بھائی فیروز پور جھرکہ اور لوہارو کے نواب تھے۔ ۲، خاندانی پنشن جو کلکٹری کے جزانے سے ملتی تھی۔ ۳، جلانا بہ کسر جیم، معنی زندہ کرنا۔ جان بخشا، زندہ رکھنا اور بہ فتح جیم بہ معنے سوختہ کرنا۔ آگ لگانا۔ میرزا نے یہاں یہ لفظ اس طرح استعمال کیا ہے کہ دونوں معنی اس سے نکالے جا سکتے ہیں۔ لیکن واضح معنی زندہ رکھنے کے ہیں۔

اے بے خبر ز لذت شرب مدام ما

دیکھا؟ ہم کو یوں پلاتے ہیں۔ دریبہ کے نبیوں اور لونڈوں کو پڑھا کر مولوی مشہور ہونا اور مسائل حیض و نفاس میں غوطہ مارنا اور ہے اور عرفا کے کلام سے حقیقت حقہ وحدت وجود کو اپنے دل نشین کرنا اور ہے، مشرک وہ ہیں جو وجود کو واجب و ممکن میں مشترک جانتے ہیں۔ مشرک وہ ہیں جو مسیلمہ کو نبوت میں خاتم المرسلین کا شریک گردانتے ہیں مشرک وہ ہیں جو نو مسلموں کو ابو الائمہ کا ہمسر جانتے ہیں۔ دوزخ ان لوگوں کے واسطے ہے۔ میں موحد خالص اور مومن کامل ہوں۔ زبان سے لا الہ الا کہتا ہوں اور دل میں لا موجود الا اللہ مولا ثر فی الوجود الا اللہ سمجھ ہوا ہوں۔ انبیاء سب واجب التعظیم اور اپنے اپنے وقت میں سب مفترض الطاعت تھے۔ محمد ﷺ پر نبوت ختم ہوئی۔ یہ خاتم المرسلین اور رحمۃ للعالمین ہیں۔ مقطع نبوت کا مطلع امامت۔ اور امامت نہ اجماعی، بلکہ من اللہ ہے اور امام من اللہ علی علیہ السلام۔ ثم حسن ثم حسین۔ اسی طرح تا مہدی موعودؑ:

بریں زیستم ہم بریں بگورم

ہاں اتنی بات اور ہے کہ اباحت اور زندقہ کو مردود اور شراب کو حرام اور اپنے کو عاصی سمجھتا ہوں۔ اگر مجھ کو دوزخ میں ڈالیں گے تو میرا جلانا مقصود نہ ہوگا۔ بلکہ دوزخ کا ایندھن ہونگا اور دوزخ کی آنچ کو تیز کروں گا تا کہ مشرکین و منکرین نبوت مصطفیؐ و امامت مرتضوی اس میں جلیں، سنو، مولوی صاحب، اگر ہٹ دھرمی نہ کرو گے۔ اور کتمان حق کو گناہ جانو گے تو البتہ تم کو یاد ہوگا اور کہو گے کہ ہاں یاد

ہے۔ جن روزوں میں تم علاؤالدین خاں کو گلستان اور بوستان پڑھاتے رہو اور تم نے ایک دن غریب کو دو تین تپانچے مارے ہیں۔ نواب امین الدین خاں ان دونوں میں لوہارو ہیں۔ علاؤالدین خاں کی والدہ نے تم کو ڈیوڑھی پر سے اٹھا دیا۔ تم باچشم پرآب میرے پاس آئے۔ میں نے تم سے کہا کہ بھائی شریف زادوں کو اور سردارزادوں کو چشم نمائی سے پڑھاتے ہیں مارتے نہیں، تم نے بے جا کیا، آیندہ یہ حرکت نہ کرنا، تم نادم ہوئے۔ اب وہ مکتب نشین اطفل سے گزر کر، پر ہفتاد سالہ کے واعظ بنے۔ تم نے کئی فاقوں میں ایک شعر حافظ کا حفظ کیا ہے۔ چوں پیر شدی حافظ اور پھر پڑھتے ہو اسکے سامنے کہ اس کی نظم کا دفتر حافظ کے دیوان سے دوچند سہ چند ہے۔ مجموعہ نثر جداگانہ اور یہ لحاظ بھی نہیں کرتے کہ ایک شعر حافظ کا یہ ہے کہ اور ہزار شعر اس کے مخالف ہیں:

صوفی بیا کہ آئنہ صاف است جام را
تا بنگری صفائے مئے لعل فام را

شراب ناب خورو روے مہ جیناں بیں
خلاف مذہب آناں جہاں اینان ہیں

چوں پیر شدی حافظ از میکدہ بیروں شو
رندی و ہوس ناکی در عہد شباب اولی

ترسم کہ صرفہ ، نبرد روز باز خواست
نانِ حلال شیخ ز آبِ حرامِ ما

ساقی مگر وظیفہ حافظ ز بادہ داد

کا شفتہ گشت طرہ دستارمولوی

میاں میں بڑی مصیبت میں ہوں۔ محل سرا کی دیواریں گر گئی ہوں۔ پاخانہ ڈھے گیا ہے چھتیں ٹپک رہی ہیں۔ تمہاری پھوپی[1] کہتی ہیں: ہائے دبی ہائے مری دیوان خانے کا حال محل سرا سے بدتر ہے۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا۔ فقدان، راحت سے گھبراتا ہوں۔ چھت چھلنی ہے۔ ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے، مالک اگر چاہے کہ مرمت کرے تو کیونکر کرے؟ مینہ کھلے تو سب کچھ ہو اور پھر اثنائے مرمت میں، میں بیٹھا کس طرح رہوں، اگر تم سے ہو سکے تو برسات تک بھائی سے مجھ کو وہ حویلی، جس میں میر حسن رہتے تھے۔ اپنی پھوپی کے رہنے کو اور کوٹھی میں سے وہ بالا خانہ مع دالان زیریں جو الٰہی بخش خاں مرحوم کا مسکن تھا میرے رہنے کو دلوادو۔ برسات گزر جائے گی۔ مرمت ہو جائے گی پھر صاحب اور میم اور بابا لوگ[2] اپنے قدیم مسکن میں آ رہیں گے۔ تمہارے والد کے ایثار و عطا کے جہاں مجھ پر احسان ہے ایک یہ مروت کا احسان میرے پایان عمر میں اور بھی سہی

صبح یک شنبہ ۲۸ جولائی ۱۸۶۲ء

غالب

---

[1] نواب علاؤالدین [2] غالب [3] اس مضمون سے ظاہر ہے کہ حمزہ خاں نے نواب علاؤالدین کے خط میں میرزا غالب کو لکھوایا ہوگا۔ اب بوڑھے ہو گئے ہو، شراب چھوڑ دو۔ ساتھ حافظ کا یہ شعر درج کر دیا ہوگا۔

---

(۲۴)

مولانا علائی!

نہ مجھے خوف مرگ، نہ دعوائے صبر ہے۔ میرا مذہب بخلاف عقیدہ قدریہ، جبر ہے۔ تم نے میانجی گری کی، بھائی نے برادر پروری کی۔ تم جیتے رہو۔ سلامت رہے

ہم اسی حویلی میں تا قیامت رہے

اس ابہام کی توضیح اور اس کی اجمالی تفصیل یہ ہے کہ مینہ شدت سے برسا۔ چھوٹا سا لڑکا ڈرنے لگا۔ اسکی دادی بھی گھبرائی۔ مجھ کو خلوت خانے کا دروازہ غرب رویہ۔ اس کے آگے ایک چھوٹے سا سہ درہ یاد تھا۔ جب تمہارے پانوں میں چوٹ لگی ہے تو میں اسی دروازے سے تم کو دیکھنے آیا تھا۔ یہ سمجھ کر خلوت خانے کو محل سرا بنایا تھا کہ گاڑی، ڈولی، لونڈی۔ اصیل، کاچھیل، تیلن، تنبولن، کہاری، پسنہاری۔ ان فرقوں کا ممر وہ دروازہ رہے گا۔ میری اور بچوں کی آمد رفت دیوان خانہ میں سے رہے گی۔ عیاذ باللہ! وہ لوگ دیوان خانہ میں سے آئیں جائیں۔ اپنے بے گانے کو ہر وقت پچھلیاں یاں نظر آئیں۔

بی وفادار، جن کو تم کچھ اور بھائی خوب جانتے ہیں۔ اب تمہاری پھوپی نے انھیں۔ وفادار بیگ، بنا دیا ہے۔ باہر نکلتی ہیں۔ سودا تو کیا لائیں گی۔ مگر خلیق اور ملنسار ہے رستہ چلتوں سے باتیں کرتی پھرتی ہے۔ جب وہ محل سے نکلیں گی۔ ممکن نہیں کہ اطراف نہر کی سیر نہ کریں۔ ممکن نہیں کہ دروازے کے سپاہیوں سے باتیں نہ کریں۔ ممکن نہیں کہ پھول نہ توڑیں اور بی بی

۱ بیگم غالب ۲ یعنی غالب، ان کی بیگم اور بچے ۳ حسین علی ۴ بیگم غالب ۵ گزرگاہ ۶ پچھلپائی چڑیل کو کہتے ہیں اس لیے کہ عام خیال ہے چڑیلوں کے پاؤں پیچھے کیطرف ہوتے ہیں۔

کو لے جا کر نہ دکھائیں اور نہیں کہیں کہ "یہ پھول تمائے چچا کے بیٹے کی کائی کے ایں۔ تمہارے چچا کے بیٹے کی کیاری کے ہیں ہے ہے۔ ایسے عالی شان دیوان خانے کی یہ قسمت اور مجھ سے نازک مزاج دیوانے کی یہ شامت، معہذا اس سہ دری کو اپنے آدمیوں کے اور لڑکوں ک کے مکتب کے لیے ہرگز کافی نہ جانا۔ مور اور کبوتر اور دنبہ اور بکری اور باہر گھوڑوں کے پاس رہ سکتے تھے؟ عرفت ربی بفسخ العزائم پڑھا اور چپ ہو رہا مگر تمہاری خاطر عاطر جمع رہے کہ اسباب وحشت وخوف نہ رہے۔ مینہ کھل گیا ہے۔ مکان کے مالکوں کی طرف سے مد شروع ہوگئی ہے۔ نہ لڑکا ڈرتا ہے نہ بی بی گھبراتی ہے۔ نہ میں لے آرام ہوں۔ کھلا ہوا کوٹھا۔ چاندنی رات، ہوا سرد، تمام رات فلک پر مریخ پیش نظر، دو گھڑی کے تڑکے کے زہر جلوہ گر۔ ادھر چاند مغرب میں ڈوبا، ادھر مشرق سے زہرہ نکلی۔ صبوحی کا وہ لطف، روشنی کا وہ عالم

۲، ماہ اگست ۱۸۶۲ء غالب

جانِ غالب، مگر جسم سے نکلی ہوئی جان، قیامت کو دوبارہ ملنے کی توقع ہے خدا کا احسان، مرزا قربان علی بیگ تمہاری کشش کے مجذوب کیوں بنتے؟ وہ تو خود سالک ہے۱ مگر ہاں یہ صاحبزادہ سعادت مند رضوان۲ سو اس کے آپ مالک ہیں۔ نواب صاحب کا ہم مطبخ اور آپ کا ہم مائدہ ہونا بہتر ہوا کاش تم یہ لکھتے کہ مشاہرہ کیا ہوتا ہے۳ اثنا عشری ایک تم ہو، سو تمہیں کیا اختیار رہے؟ البتہ عشرہ مبشر کی اولیت پر مدار ہے۔ باپ تمہارا خلاف قاعدہ اہل سنت و جماعت عشرہ میں سے ثلثہ کو کم کرتا تھا۔۴ رضوان نے نہ مانا۔ کیونکر مانتا؟ وہ ثلثہ کا دم بھرتا تھا۔ تہور خاں صاحب کے باپ میں بندہ جویا اس خبر کا ہے کہ اب لوہارو سے ان ک ارادہ کدھر ہے؟

رضواں کو دعا پہنچے۔ نواب صاحب کی عنایات اور مولانا علائی کی صحبت مبارک ہو۔ پیر جی سے جب پوچھتا ہوں کہ، تم خوب ہو، اور وہ کہتے ہیں کیا کہنا۔ اور میں پوچھتا ہوں کس کا؟ تو وہ فرماتے ہیں: ''مرزا شمشاد علی بیگ کا۔'' ایں اور کسی کا نام تم نہیں لیتے؟ دیکھو یوسف علی خاں بیٹھے ہیں، ہیرا سنگھ موجود ہے۔ واہ صاحب! میں کیا خوشامدی ہوں جو منہ دیکھی کہوں؟ میرا شیوہ حفظ الغیب ہے، غیب کی تعریف کرنی کیا عیب ہے؟ ہاں صاحب آپ ایسے ہی وضعدار ہیں۔ اس میں کیا ریب ہے۵۔

صبح شنبہ۔ یکم ستمبر ۱۸۶۲

غالب

۱؎ سالک قربان علی بیگ کا تخلص تھا۔ اس کی رعایت سے مجذوب کا لفظ لائے۔ مراد یہ کہ تمھاری کشش انھیں نہ کھینچ سکے۔ اس کا بھائی شمشاد علی بیگ رضوان پہنچ گیا۔ ۲؎ شمشاد علی بیگ رضواں لفظ سالک کی رعایت بھی واضح ہے۔ ۳؎ یعنی کھانا تو تمھارے ساتھ کھانے لگا، لیکن تنخواہ کیا ٹھہرائی؟ ۴؎ مطلب یہ کہ علائی بارہ روپے تنخواہ دلانا چاہتے تھے پھر اس سے ابتدا کی لیکن امین الدین احمد خاں نے سات روپے سے شروع کرانا چاہی۔ ۵؎ یہ مکالمہ ہے اور میں نے کامے لگا کر اقوال الگ الگ کر دیے ہیں تاکہ مکالمے کے سمجھنے میں وقت نہ رہے۔

Iqbal Cyber Library. All rights reserved. ©2002-2006

(۲۶)

میاں! تم میرے ساتھ وہ معاملے کرتے ہو۔ جو احیاء سے مرسوم و معمول ہیں لے۔ خیر تمہارا حکم بجالایا۔ غزل بعد اصلاح کے پہنچتی ہے۔ جناب لفٹنٹ[۲] گورنر بہادر نے دربار کیا۔ میری تعظیم و توقیر اور میرے حال پر لطف و عنایت میری از رو و استحقاق سے زیادہ، بلکہ میری خواہش اور تصور سے سوا مبذول کی۔ اس ہجوم امراض جسمانی اور آلام روحانی کو ان باتوں سے کیا ہوتا ہے؟ ہر دم، دم نزع ہے۔ دل غم سے خونریز ہوگیا ہے۔ کہ کسی بات سے خوش نہیں ہوسکتا۔ مگر کو نجات سمجھے ہوئے ہوں اور نجات کا طالب ہوں۔ کئی دن سے کوئی تحریر دل پذیر تمہاری نظر نہیں آئی۔ نہ مجھے تم نے یاد کیا، نہ اپنے بھائی کو کچھ لکھا ہ۔ اب اس کا جواب جلد ہی لکھو۔ پہلے اپنے بچوں کا حال، پھر وہاں کے اوضاع، جیسا تمہارا قاعدہ ہے۔ منقح اور منفصل لکھو۔ فقط

؍ نجات مارچ ۱۸۶۳

طالب، غالب

(۲۷)

اقبال نشانا!

بخیر و عافیت و فتح و نصرت لوہار پہنچنا مبارک ہو۔ مقصود ان سطور کی تحریر سے یہ ہے کہ مطبع اکمل المطابع میں چند احباب میرے مسودات اردو جمع کرنے پر اور اس کے چھپوانے پر آمادہ ہوئے ہیں۔ مجھ سے مسودات مانگتے ہیں اور اطراف و جوانب سے بھی فراہم کیے ہیں۔ میں مسودہ نہیں رکھتا۔ جو لکھا وہ جہاں بھیجنا ہوا۔ وہاں بھیج دیا۔ یقین ہے کہ خط میرے تمہارے پاس بہت ہوں گے۔ اگر ان کا ایک پارسل بنا کر بسبیل ڈاک بھیج دو گے یا آجکل میں کوئی ادھر آنے والا ہو اور اس کو دو گے تو موجب میری خوشی کا ہوگا اور میں ایسا جانتا ہوں کہ اس کے چھاپے جانے سے تم بھی خوش ہو گے۔

بچوں کو دعا۔

۱۸۶۳ء

غالب

(۲۸)

ولی عہدی میں شاہی ہو مبارک
عنایات الٰہی ہو مبارک

اس امرِ فرخ و ہمایوں کی شہرت میں کوشش بے حوصلگی ہے اور اس کے اخفا میں مبالغہ خفقانیت۔تم اپنی زبان پر نہ لاؤ۔اگر کوئی اور کہے۔ مانع نہ آؤ اشتہار، نہ استتار۔[۴]

دور ہوا مگر مدت معینہ کے بعد اور پھر جھاگ نہ آنا اور تمہارے پکارنے سے متنبہ ہو جانا مادے کی کمی کی علامتیں

[۱] یعنی زندوں سے عمل میں آتے ہیں۔[۲] سر رابرٹ منٹگمری لفٹنٹ گورنر پنجاب کا دربار جو ۳ مارچ ۱۸۶۳ء کو دہلی میں منعقد ہوا تھا۔[۳] اکمل المطابع کے مالک حکیم غلام رضا خاں تھے۔منشی بہادل لال مشتاق جو غالب کے عزیز شاگرد تھے اس طبع میں کام کرتے تھے۔وہی اکمل الاخبار کے نام سے ایک اخبار بھی نکالتے تھے۔[۴] یعنی نہ اعلان کرانا مناسب ہے نہ چھپانا، مطلب یہ کہ والد کی علالت کے باعث دونوں کو ریاست کا انتظام سونپ دیا گیا ہیں۔شدت میں جس قدر خفت ہو غنیمت ہے۔

میرے خطوط اردو کے ارسال کے باب میں جو کچھ تم نے لکھا، تمہارے حسن طبع پر تم سے بعید تھا۔ میں سخت بے مزہ ہوا۔اگر بے مزگی کے وجوہ لکھوں تو شاید ایک تختہ کاغذ کا سیاہ کرنا پڑے۔اب ایک بات موجز و مختص لکھتا ہوں۔سنو بھائی، اگر

ان خطوط کا تم کو اخفا منظور ہے اور شہرت تمہارے منافی طبع ہے تو ہرگز نہ بھیجو۔ قصہ تمام ہوا۔ اور اگر ان کے تلف ہونے کا اندیشہ ہے تو میرے دستخطی خطوط اپنے پاس رہنے دو اور کسی متصدی سے نقل اتروا کر چاہو کسی کے ہاتھ، چاہو بسبیل پارسل ارسال کرو۔ لیکن خدا کے واسطے کہیں غصہ آ گر عطائے تو بقائے تو کہہ کر اصلی خطوط نہ بھیج دینا کہ یہ امر میرے مخالف مقصود ہے۔ بھلا صاحب، ڈرتا ہوں میں تم سے۔ ادھر خط پڑھا ادھر جواب لکھ کر ڈاک میں بھیجا۔ تمہارا خط رہنے دیا۔ جب آ کا شمشاد علی بیگ آئیں گے۔ پڑھ لیں گے۔

۱۸۶۳ء غالب

All rights reserved. ©2002-2006

لاموجود الا اللہ۔ اس خدا کی قسم جس کو میں نے ایسا مانا ہے اور اس کے سوا کسی کو موجود نہیں جانا ہے کہ خطوط کے ارسال کرمکرو نہ رکھنا راہ ملال نہ تھا۔ طالب کے ذوق کو ست پا کر میں متوقف ہو گیا۔ متوسط ایک جلیل القدر آدمی اور طالب کتب کا سوداگر ہے۔ اپنا نفع نقصان سوچے گا۔ لاگت بچت کو جانچے گا۔ میں متوسط کو مہتمم سمجھتا تھا اور یہ خیال کیا تھا کو یہ چھپوائے گا۔ تیس رقعے ایک جگہ سے لے کر ان کو بھیجے۔ اس کی رسید میں تقریباً انھوں نے طلب رقعات بہ تکلف سوداگر لکھی اور کسی سوداگر کو مفقود الخبر لکھا۔ ظاہرا کتابیں لے کر کہیں گیا ہو گا یا کتابیں لینے گیا ہو گا۔ یہ تیئس لفافے اور چونتیس خط بدستور میرے بکس میں محفوظ رہیں گے۔ اگر متوسط تبقاضا طلب کرے گا۔ ان خطوط کی نقلیں اس کو اور اصل تم کو بھیج دوں گا۔ ورنہ تمہارے بھیجے ہوئے کاغذ تم کو پہنچ جائیں گے۔

میاں ان خطوط کے ارسال میں تم نے مجھ سے وہ کیا جو میں نے تم سے دو جانہ میں کیا تھا۔ بھلا میں تو پیر خرف ہوں اور سن خرافت کو نسیان لازم ہے۔ تم نے کیا سمجھ کے کپڑا لپیٹ کر مختم کر کے بھیجا؟ خطوں پر ایک قلیل العرض کاغذ لپیٹ کر ارسال کیا ہوتا۔ اگر منشی بہادری لال میر اور شہاب الدین کا دوست نہ ہوتو پچاس روپے کا مجھ کو دھپا لگتا۔

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت

صبح شنبہ ۳۰ مئی ۱۸۶۳ء

غالب

(۳۰)

بداست مرگ ولے بدتراز گمان تو نیست

مکرر لکھ چکا ہوں کہ قصیدے کا مسودہ میں نے نہیں رکھا۔

مکرر لکھ چکا ہوں کہ مجھے یاد نہیں کون سی رباعیاں مانگتے ہو۔ پھر لکھتے ہو کہ رباعیاں بھیج ،قصیدہ۔ معنی اسکے یہ کہ تو جھوٹا ہے ابن کے تو مقرر بھیجے گا۔ بھائی قرآن کی قسم ۔انجیل کی قسم ۔توریت کی قسم ،زبور کی قسم ۔ہنود کے چار بید کی ق سم ،دساتیر کی قسم ژند کی قسم ،اوستا کی قسم ،گرو کے گرنتھ کی قسم نہ میرے پاس وہ قصیدہ۔ نہ مجھے رباعیاں یاد۔ کلیات کے باب ہیں جو عرض کر چکا ہوں۔

بر ہمانیم کہ ہستیم و ہماں خواہد بود

جب میں دس پندرہ جلدیں منگا لوں گا ،ایک بھائی کو اور ایک تم کو ارمغاں بھیجوں گا اور اگر بھائی کو جلدی ہے تو لکھنو میں اردو اخبار کا مطبع ،مالک اس کا منشی نو لکشور مشہور جتنی جلدیں چاہیں لکھنو سے منگا لیں۔ میں بہر حال دو جلدیں جس وقت موقع ہو گا ،بھیج دوں گا۔

۱۱جون ۱۸۶۳ء

نجات کا طالب غالب

---

۱ حواس باختہ ۲ مہر لگا کر۔ پارسل کپڑے میں لپیٹ کر ،مہریں بھیجنے پر جرمانہ نہ ہوتا تھا۔ لیکن چونکہ منشی بہادری لال۔ غالب اور شہاب الدین احمد خان کے دوست تھے۔ اس لیے کوئی پرسش نہ ہوئی۔

میری جان!

مرزا علی حسین خاں آئے اور مجھ سے ملے۔ میں نے خطوط مرسلہ تمہارے یک مشت ان کو دیے۔ اب تمہارے پاس بھیجنے کا ان کو اختیار ہے۔ رسید کا البتہ مجھے انتظار ہے۔ علی حسین خاں سے آنے کی حقیقت اور یہاں اقامت کی مدت پوچھی گئی۔ جواب پایا کہ ایک مہینے اور دس دن کی رخصت لیکر آیا ہوں۔ بی بی بیمار ہے۔ اس کا استعلاج منظور ہے۔ میری جان علی حسین کے کام آئے تو دریغ نہ کروں۔ بھلا یہ مبالغہ ہی بلکہ بے شک تبلیغ وغلو ہے۔ لیکن قریب اس کے یعنی جو چیز امکان سے باہر نہ ہو، اس میں قصور کیوں کر کیا جائے گا۔ بلکہ شاید تمہاری سپارش کی بھی حاجت نہ ہو مگر سوچو کہ آئین غمخواری و اندوہ گساری کیا ہوگا۔ میر زاہد وضع و بدروش نہیں کہ پند و بند کا محتاج ہو۔ کوئی اس کا مقدمہ کسی محکمہ میں دائر نہیں کہ مصلحت و مشورت کی احتیاج ہو۔ رہے امور خانگی یعنی بی بی اور اسکے آباد و اخوات کے معاملے۔ ان میں نہ تم کو دخل، نہ مجھ کو مداخلت۔ تم علی حسین خاں کو اس پیوند پر کیا چھیڑتے ہو اور یہ نہیں سمجھتے کہ اس کا دادا کتنا بڑا آدمی تھا اور اس کے دادا کی اور اس کی سسرال ایک ہے۔ یہ ذریعہ فخر ہے اس کو اور اس کے طفیل سے تم کو بلکہ تھوڑی سی نازش اگر مجھ ننگ اقربا کے حصے میں بھی آ جائے تو کچھ بعید نہیں۔

ہر چند تمہارا ہر کلمہ ایک بدلہ ہے۔ لیکن اس ''خسر'' ''خسروانی'' نے مار ڈالا۔ کیا کہوں جو مجھ کو مزا ملا ہے کہاں ''خسرو'' ''خسران'' لغات عربی الاصل اور کہاں روز

مرہ مشہور کہ خسر سسرے کو کہتے ہیں۔ صنعت اشتقاق و طباق کو کس سینہ زوری سے برتا ہے۔ اچھا میرا میاں، یہ خسر بمعنی پدر زن کیا لفظ ہے۔ حروف بین الفارسی و العربی مشترک ہیں۔ لیکن ان معنوں میں نہ فارسی ہے۔ نہ عربی ہے۔ فارسی میں پدر زن بہ فک اضافت کہتے ہیں۔ عربی میں خسر جس طرح بمعنی نقصان لغت منصرف ہے۔ شاید سسرے کا

---

۱ ژند پارسیوں کی مذہبی کتاب اور پازند اس کی تفسیر۔ اوستا بھی پارسیوں کی مذہبی کتاب ہے۔

اسم جامد ہو یا فی الحقیقت سسرے کی تفریس و تعریب ہو۔ یہ پرسش نہ بہ سبیل استہزا ہے۔ بلکہ یوسف علی خاں عزیز مانند اس دہقان کہ جو دانہ ڈال کر مینہ کا منتظر ہو رہا ہو آئے اور نہ برسے۔ مضطر و حیران ہے۔ علی حسین خاں آتے ہیں۔ آئے۔ وہ آئے تو کیا لائے۔

یک شنبہ ۳۰ محرم ۱۲۸۰ھ مطابق ۲۱ جون

۱۸۶۳ء غالب

صاحب!

میں از کار رفتہ و درماندہ ہوں۔ آج تمہارے خط کا جواب لکھتا ہوں۔ لفظ خسر کے باب میں اتنی توضیح کیا ضرور تھی۔ میرا علم لغات عربیہ کا محیط نہیں اور یہ بطریق حق الیقین جانتا ہوں کہ خسر لغات فارسی نہے سسرے کی تفریس سے خسر پیدا ہوا ہو۔ کیا عجب ہے تم سے اسکی تحقیق چاہی تھی کہ یہ لغت عربی الاصل نہ ہو، وہ معلوم ہوا کہ عربی نہیں، لغت ہندی ہے اور یہی تھا میرا عقیدہ

علی حسین خاں آئے۔ دو تین بار مجھ سے مل گئے۔ اب نہ وہ آسکتے ہیں، نہ میں جا سکتا ہوں۔ نصیب دشمناں وہ لنگڑے، میں لولا۔ انکے پانو کا حال مفصل تم کو معلوم ہوگا۔ جونکیں لگیں۔ کے ہوا۔ کہاں تک نوبت پہنچی۔ میری حقیقت سنو۔ مہینے بھر سے زیادہ کا عرصہ ہوا۔ بائیں پانو میں ورم۔ لف پا سے پشت پا کو گھیرتا ہوا پنڈلی تک آماس ! کھڑا ہوتا ہوں تو پنڈلی کی رگیں پھٹنے لگتی ہیں۔ خیر، اٹھا۔ روٹی کھانے محل سرا نہ گیا۔ کھانا یہیں منگا لیا۔ پیشاب کو کیونکر نہ اٹھوں۔ حاجتی رکھ لی۔ بغیر اکڑو۔ بیٹھے بات نہیں بنتی۔ پاخانے کو اگر چہ دوسرے تیسرے دن جاؤں۔ مگر جاؤں تو سہی۔ یہ سب موقعے خیال میں لاکر سوچ لو کہ کیا گزرتی ہوگی۔ آغاز فتق ہے

مزید علیہ یا مستزاد:

پیری و صد عیب چنیں گفتہ اند
اپنا یہ مصرع بار بار چپکے چپکے پڑھتا ہوں

اے مرگ ، ناگہاں تجھے کیاانتظار رہے؟

مرگ اب ناگہانی کہاں رہی ۔ اسباب وآثار سب فراہم ہیں ۔

ہائے الٰہی بخش خاں مغفور کا کا مصرع ہے:

آہ جی جاؤں نکل جائے اگر جان کہیں

زائد بے فائدہ ۔

جمعہ ۳، جولائی ۱۸۶۳ء

مرگ کا طالب ، غالب

UrduCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

جانا عالی شانا!

پہلے خط اور پھر، بتوسط برخوردار علی حسین مجلّد کلیات فارسی پہنچے۔ حیرت ہے کہ چار روپے قیمت کتاب، اور چار آنے محصول ڈاک،

۱؎ ورم ہو جن ۲؎ فوطوں کی ایک بیماری

قالب انطباع میں آکر پانچ روپے قیمت اور پانچ آنے محصول قرار پاوے۔ خیر جہاں سو وہاں سوا سو۔ میرا حال تمہیں اور تمہارا حال مجھے معلوم ہے۔

ایں ہم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر

اب کے چھٹے میں شاید نہ دے سکوں۔ نومبر سنہ حال میں پچاس روپے تمہارے پاس پہنچ جائیں گے۔ ان شاء اللہ العلی العظیم۔ میں بے حیا تھا نہ مرا اچھا ہونے لگا۔ عوارض میں تخفیف ہے۔ طاقت آتی چلی ہے۔ مختصر مفید:

در نامہ جز ایں مصرع شاعر چہ نویسم
اے وائے ز محرومی دیدار و دگر ہیچ

صبح یک شنبہ ۲۰ ستمبر ۱۸۶۳ء نجات کا

طالب، غالب

اقبال نشان مرزا علاؤالدین خاں بہادر کو غالب گوشہ نشیں کی دعا پہنچے ۔ برخوردار علی حسین خاں آیا۔ مجھ سے ملا، بھائی کا حال اس کی زبانی معلوم ہوا۔ حق تعالیٰ اپنا فضل کرے ۔ الولدسر لابیہ، تم اس کے مصداق کیوں بنے؟ خفقان و مراق اگر چہ تمہارا خانہ زادہ موروثی ہے ۔لیکن آج تک تمہاری خدمت میں حاضر نہ ہوا تھا۔ ایک کیوں آیا؟ اگر آیا تو ہرگز اس کو ٹھہر نے نہ دو۔ ہانک دو۔ خبردار، اس کو اپنے پاس نہ رہنے دینا۔

شفیق مکرم لطف مجسم منشی نولکشور صاحب بسبیل ڈاک یہاں آئے ۔ مجھ سے اور تمہارے چچا اور تمہارے بھائی شہاب الدین خاں سے ملے۔ خالق نے ان کو زہرہ کی صورت اور مشتری کی سیرت عطا کی ہے۔ گویا بجائے خود قران السعدین، تم سے میں نے کچھ نہ کہا تھا اور کلیات کے دس مجلّہ کی قیمت پچاس روپے مان لیے تھے ۔ اب ان سے جو ذکر آیا تو انھوں نے پہلی قیمت مشتہرہ اخبار لینی قبول کی یعنی تین روپے چار آنے فی جلد۔ اس صورت میں دس جملہ کے بتیس روپے آٹھ آنے ہوئے ۔ گویا بتیس روپے آٹھ آنے میں دوں اور بتیس روپے آٹھ آنے تم دو۔ ہمگی پینسٹھ روپے مطبع اودھ اخبار میں پہنچانے چاہییں ۔ میں دسمبر ماہ حال کی دسویں گیارھویں کو طالب ہوں گا۔

کہو بتیس روپے آٹھ علی حسین کو دے دو ۔ کہو لکھنو بھیج دوں ۔ اس نگارش کا جواب جلدی لکھو۔

بھائی صاحب کی خدمت میں میرا اسلام کہنا اور استاد میر جان کے میری طرف سے قدم لینا۔

۲۱ جمادی الثانی سال غفر (۱۲۸۰) ھ مطابق ۳ دسمبر سال: کیا غضب ہے'' (۱۸۶۳ء) یہ گویا تاریخ وفات جناب نواب گورنر جنرل لارڈ الگن صاحب بہادر کی ہے۔

(نجات کا طالب، غالب)

(۳۵)

مولانا علائی!

واللہ علی حسین خاں کا بیان بمقتضائے محبت تھا۔ ہر بار کہتا تھا اور یہ کہتا تھا کہ حق بجانب ان کے ہے۔ نہ کوئی

ہندوستان کا وائسرائے۔ جس نے ۱۸۶۳ء میں بہ مقام دھرم سالہ وفات پائی

ہم سخن نہ کوئی ہم نفس، نہ سیر، نہ شکار، نہ مجلس، نہ دربار۔ تنہائی و بے شغل اور بس، جی کیونکر نہ گھبرائے؟ خفقان کیونکر نہ ہو جائے۔

نہ دن یاد، نہ تاریخ، آج چوتھا یا بھائی شاید بھول گیا ہوں۔ پانچواں دن ہے کہ منشی نولکشور بسواری ڈاک راہگرائے لکھنو ہوئے۔ کل پہنچ گئے ہوں یا آج پہنچ جائیں۔ آج روز یک شنبہ ۱۳ دسمبر کی ہے۔ ایک دن منشی صاحب میرے پاس بیٹھے تھے۔ اور برخوردار شہاب الدین خاں بھی تھا۔ میں نے ثاقب کو مخاطب کر کے کہا۔ ''اگر میں دنیا دار ہوتا تو اس کی نوکری کہتا۔ مگر چونکہ فقیر تکیہ دار ہوں تو یہ کہہ سکتا ہوں کہ تین جگہ کا روزینہ دار ہوں۔ ساڑھے باسٹھ روپے ماہوار یعنی سات سو پچاس روپے سرکار انگریزی سے پاتا ہوں۔ بارہ سو روپے رام پور سے۔ چوبیس روپے سال ان مہاراج سے۔ توضیح یہ کہ دو برس سے ہر مہینے میں چار بار اخبار مجھ کو بھیجتے ہیں۔ قیمت نہیں لیتے۔ مگر ہاں۔ اڑتالیس ٹکٹ میں مطبع پہنچا دیا کرتا ہوں۔ بتیس روپے آٹھ آنے جو میں نے پوچھے تھے کہ علی حسین خاں کے حوالے کردوں۔ مقصود اس سے یہ تھا کہ ارسال بسبیل ہنڈوی دشوار ہے خیر، اب جس

طرح ہوگا حصار پر ہنڈوی لکھوا کر تم کو بھیج دوں گا۔ تم حصار پہنچ کر روپے منگوا لیجیو۔ خدا چاہے تو دسمبر میں روپیہ تمہارے پاس پہنچ جائے گا۔

استاد میر جان صاحب کو قدم بوس کہہ کر مجھ کو فرعون بننا پڑا۔ دہائی خدا کی۔ اب ایسا نہ کروں گا۔ میرا اسلام بلکہ دعا ان کو کہہ دینا۔

پرسوں مولوی صدر الدین خاں صاحب کو فالج ہو گیا تھا۔ سیدھا ہاتھ رہ گیا زبان موٹی ہو گئی ہے۔ بات مشکل سے کرتے ہیں اور کم سمجھ میں آتی ہے۔ میں اپاہج ہوں جا نہیں سکتا۔ جو ان کو دیکھ آتا ہے اس سے ان کا حال پوچھا جاتا ہے۔ دن، تاریخ صدر میں لکھ آیا ہوں۔ کاتب کا نام غالب ہے کہ دستخط سے پہچان جاؤ گے۔

یک شنبہ ۱۳ دسمبر ۱۸۶۳ء

(۳۶)

علائی مولائی کو غالب طالب کی دعا، بے چارے مرزا۲ کا معاملہ علی حسین خاں کی معرفت طے ہوگیا۔ یہاں پندرہ کا سوال، وہاں دس میں سے تین کم کرنے کا خیال۔ متوسط دوسرا جو علی حسین خاں بہادر کے بعد درمیان آئے۔ وہ کیا کرے اور کیا کہے؟ مرزا قانع و متوکل ہیں۔ نہ پندرہ مانگتے ہیں نہ دس۔ اللہ بس ما سوا ہوس۳ جناب ترولینل۴ صاحب، بھائی کے دوست دلی آئے لارڈ صاحب کہلاتے ہیں۔ سنتا ہوں کہ کل اکبرآباد جاتے ہیں بھائی علی بخش خاں مدت سے بیمار تھے۔ رات بارہ پر دو بجے مر گئے۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون

تمہارے عم نامدار آج دن کے بارہ بجے سلطان جی گئے ہیں۔ میں نہ جاسکا۔ تجہیز و تکفین ان کی طرف سے عمل میں آئیگی۔ اور پر تین بجے یہ خط میں نے تمہیں لکھا ہے۔ کل شنبہ ۲ جنوری کو ڈاک گھر بھیج دوں گا۔ مشفقی میر جان صاحب کو سلام مع الاکرام۔

یکم جنوری ۱۸۶۴ء

نجات کا طالب، غالب

---

۱ اس فقرے کی ترتیب میں جو خوبی ہے وہ ظاہر ہے۔ یعنی غالب بمعنی گمان قوی استعمال ہوا ہے۔ لیکن ساتھ ہی نام بھی بتا دیا۔ تاریخ میں نے بہ نظر یکسانی ترتیب آخر میں رکھی ہے ۲ شمشاد علی بیگ رضوان ۔ ۳ یہ بحث خط نمبر ۲ میں آچکی ہے۔ ۴ غالباً سر چارلس ٹرویلین مراد ہے جو ۱۸۲۶ء میں ہندوستان آیا۔ کئی برس دہلی میں اسسٹنٹ کمشنر رہا۔ جنوری ۱۸۶۳ء میں سوپریم کونسل کا رکن مالیات بنا۔ اس نے لارڈ میکالے کی بہن سے شادی کی تھی۔ ۵ غالب کے نسبتی بھائی۔

(۳۷)

میری جان غالب کثیر المطالب کی کہانی سن۔ میں اگلے زمانے کا آدمی ہوں۔ جہاں ایک امر کی ابتداء دیکھی۔ یہ جان لیا کہ اب یہ امر مطابق اس ہدایت کے نہایت پذیر ہوگا۔ یہاں اختلاف طبائع کا وہ حال کہ آغاز مغشوش، انجام مخدوش، مبتدا خبر سے بیگانہ، شرط جزا سے محروم، سنا اور متواتر سنا کر قصہ طے ہو گیا۔ اب علاؤ الدین خاں مع قبائل آئیں گے۔ دل خوش ہوا کہ اپنے محبوب کی شکل مع اس کے نتائج کے دیکھوں گا۔ پرسوں آخر روز بھائی پاس گیا۔ اثناء اختلاط و انبساط میں میں نے پوچھا کہ کہو بھئی علاؤ الدین خاں کب آئیں گے؟ جواب کچھ نہیں۔ اجی وہ قصہ تو طے ہو گیا؟ ہاں وہ تو روپیہ میں نے دے بھی دیا۔ میں نے کہا تو اب چاہیے کہ وہ آئیں۔ فرمایا کہ شاید ابھی نہ آئے۔"

معلوم ہوا کہ خیر، ٹھینگا باجا

ناچار ارادہ کیا کہ جو کچھ کہنا تھا اب میں لکھ کر بھیجوں۔ پرسوں تو شام ہو گئی تھی۔ کل بغل گیر ہونے والوں نے دم نہ لینے دیا۔ اس پر طرہ یہ کہ ثاقب نے کہا کہ بھائی تم سے شاکی ہیں۔ اب ضرور آپڑا کہ گزارش مدعا سے پہلے تمہارے رفع حالل میں کلام کروں۔

بھائی، تم میرے فرزند بلکہ بہ از فرزند ہو۔ اگر میرا صلبی بیٹا دیدہ دانست و تحریر و تقریر کا ہوتا تو میں اس کو اپنا یار وفادار اور ذریعہ افتخار جانتا، میرے خطوط کے نہ پہنچے کا گلہ غلط۔ تمہارا کونسا خط آیا کہ اس کا جواب یہاں سے نہ لکھا گیا؟ میرے پاس جو مقاصد ضروری فراہم تھے۔ وہ میں نے اس نظر سے نہ لکھے کہ اب تم آتے ہو۔

زبانی گفت وشنید ہو جائے گی۔ ثاقب نے چلتی گاڑی میں روڑا اٹکا دیا۔ مجھے تو طیہ وتمہید میں ایک ورق لکھنا پڑا، ورنہ نگارش یہاں سے نہ ہوتا۔

یا اسداللہ الغالب

با من از جہل معارض شدہ نا منفعلے

کہ گرش ہجو کنم ایں بودش مدح عظیم

یہ رسالہ موسوم بہ محرق قاطع برہان، جو ثاقب نے تم کو بھیجا ہے میرے کہنے سے بھیجا ہے اور اس ارسال سے میرا مدعا یہ ہے کے معاینے کے وقت اس کتاب کی بے ربطی عبارت پر او میری اپنی قرابت اور نسبت ہائے عدیدہ پر نظر نہ کرو۔ بیگانہ وار دیکھو اور از روے انصاف حکم، بنو بے حیف و بلبل۔

اس نے جو مجھے گالیاں دی ہیں۔ اس پر غصہ نہ کرو۔ غلطیاں عبارت کی ،شدت اطناب عمل کی صورت سوال دیگر جواب دیگر ان باتوں کو مطمح نظر کرو، بلکہ اگر فرصت مساعدت کرے تو ان مراتب کو الگ الگ کاغذ پر لکھو ب اور بعد اتمام میرے پاس بھیج دو۔ میرا ایک دوست، روحانی کہ وہ منجملہ جال الغیب ہے۔ ان ہفوات کا خاکہ اڑا رہا ہے۔ خیر رخشاں نے اسکو مدد دی ہے تم بھی بھائی، مدد دو۔

اور وہ امر مبہم کو جو تمہارے والد کی تقریر سے دل نشین نہیں ہوا یعنی قصہ چک جانا اور دلی آنا، اس کا ماجرا مفصل و مشرح لکھ۔

دن، تاریخ اپنا نام آغاز کتابت میں لکھ آیا ہوں۔ اب ارسال جواب کی تاکید کے واسطے اور کیا لکھوں۔ فقط چہار شنبہ ۱۸ مئی ۱۸۶۴ء بقول عوام باسی عید کا دن، صبح کا وقت

(۳۸)

اے میری جان!

مثنوی'' ابر گہر بار، کون سی فکر تازہ تھی کہ میں تجھ سکوب کو بھیجتا؟ کلتاب میں موجود ہے۔ معہذا شہاب الدین خان نے بھیج دی، میں مکرر کیا بھیجتا، تپ محرق کے دیکھنے سے انکار کیوں کرتے ہو؟ اگر منافع طبع تحریر کو بسبب انزجار، نہ دیکھا کرتے تو فریقین کی کتب مبسوط کہاں سے موجود ہوتیں؟

افسوس کہ میں نے عربی نہیں۔ اب مانا، یہ ایک سہو طبیعت تھا۔ میرا اعتراض تو خلط مبحث پر ہے،

''افسوس و افسوس ایک کیوں ہو جائے؟

ایک کیوں ہو جائے؟

یہاں کے اطوار مجھ سے باوجود قرب مخفی اور تم پر باایں ہمہ بعد آشکارا، دوران باخبر در حضور و نزدیکان بے بصر دور، رو پیہ آ گیا۔ دل سے نکلا مخزن سے نکلا، ہاتھ سے نہیں نکلا، جب ہاتھ سے نکل جائے گا اور جنس مول لی جائے گی۔ اور یہ گند کٹ جائے گا۔ تب ترساں ترساں پیشگاہ نادری میں تمہارے یہاں آنے کے باب میں کچھ عرض کیا جائے گا۔ میں ان دنوں

۱۔ ایسی طوالت جو دلگیر کر دے۔ غالب نے نظم میں بھی یہ ترکیب استعمال کی

لغو و حشو و ادعاے محض و اطناب ممل

مور و۲ موش و سوسارو گربہ یکجا کردہ است

مردود بھی ہوں۔ والسلام

صبح دم ، یا ابو لبشر گفتم
پارہ زر بدہ کہ زر داری
حیف باشد کہ از چو من پسرے
خاک رنگیں عزیز تر داری
گنج وان سخن حوالہ تست
خود بہ بین تا چہ در نظر داری
گفتم اینک بہ بند پیمانے
زر من مے وہی، اگر داری
سر زنبیل آں عمر و عیار
گر زعیاریش خبر داری
بکشا زود و زر بریز و بگوے
کہ ہمیں مدعا مگر داری
گفت بابا فسانہ بودہ است
چہ فرد ریزم و چہ بر داری

دو شنبہ ۲۳ ذی الحجہ ۱۲۸۰ھ
مطابق ۳۰ مئی ۱۸۶۴ء

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved ©2002-2006

۱؎ غالب کی ایک ناتمام مثنوی میں غزوات نبوی کی نظم کرنا مقصود تھا لیکن اس کے صرف مقدمات ہی مکمل ہوئے۔ یہ کلیات نظم فارسی میں چھپ چکی ہیں لیکن اس مثنوی کو ایک مرتبہ علیحدہ بھی چھاپا گیا تھا۔ ۲؎ یعنی قاطع مولفہ مولوی سعادت علی ۳؎ یعنی دیکھنے سے طبیعت کا گریز کرنا اور راضی نہ ہونا۔

علائی مولائی، غالب کو اپنا دعا گو اور خیر خواہ تصور کریں مادہ ہائے تاریخ کو نہ آپ قالب نظم میں لائیں اور نہ اور کو اس امر منکر کی تکلیف دیں۔ بھائی سمجھو۔ یزید پر لعن عبادت سہی لیکن کہہ دیتے ہیں کہ بر یزید لعنت۔ کسی مومن نے اس کی ہجو میں قصیدہ نہیں لکھا۔

ابداع مادہ ہائے تاریخ[1] تمہارے حسنات میں لکھا گیا ہے۔ مثاب[2] تم ہو چکے۔ اجر پاؤ گے ان شاء اللہ۔ اب اپنے کو بدنام اور کسی ملول اور عداوت کو ظاہر اور اگر ظاہر ہو تو محکم نہ کرو۔

علی بخش خاں مرحوم مجھ سے چار برس چھوٹا تھا۔ میں ۱۲۱۲ء میں پیدا ہوں۔ اب کے رجب کے مہینے سے اور تہتر واں برس شروع ہوتا ہے۔ اس نے ۲۶ برس کی عمر پائی۔ تحریر و تقریر کا آدمی تھا۔ اکبر آباد میں میور صاحب[3] سے ملے۔ اثنائے مکالمت میں کہنے لگے کہ میں چچا جان[4] کے ساتھ لارڈ لیک[5] صاحب کے لشکر میں موجود تھا اور ہولکر[6] سے جو محاربات ہوئے۔ ان میں شامل رہا ہوں۔ بے ادبی ہوتی ہے۔ ورنہ اگر قبا و پیرہن اتار کر دکھاؤں۔ تو سارا بدن ٹکڑے ٹکڑے ہے۔ جا بجا تلوار اور برچھی کے زخم ہیں۔

---

[1] تاریخ کے نئے مادے پیدا کرنا [2] مستحق ثواب [3] سر ولیم میور، ۱۸۳۷ء میں سول سروس میں بھرتی ہو کر آیا۔ یو پی میں پہلے سیکرٹری رہا۔ پھر بورڈ ریونیو کا ممبر اور آخر میں گورنر بنا، [4] نواب احمد بخش مرحوم والی فیروز پور جھرکا لوہارو۔ [5] انگریز جرنیل

جس نے ۱۸۰۲ء میں علی گڑھ، دہلی اور آگرہ مرہٹوں سے چھینے۔ ۲۔ جسونت راؤ ہلکر جس نے ۱۸۰۵ء میں انگریزوں سے صلح کرکے اندور کی ریاست لے لی تھی۔

وہ ایک بیدار مغز اور دیدہ ور آدمی۔ ان کو دیکھ کر کہنے لگا کہ نواب صاحب، ہم ایسا جانتے ہیں کہ تم جرنیل صاحب کے وقت میں چار پانچ برس کے ہو گے۔ یہ سن کر آپ نے کہا کہ درست، بجا ارشاد ہوتا ہے۔

خدائش بیامرزاد وبدیں ور و غہاے بے نمک مگیر او۔

غالب

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

(۴۰)

اجی مولانی علائی!

نواب صاحب دو مہینے تک کی اجازت دے چکے اور یہ میں خبر تراشی نہیں کرتا، مرزا علی محمد بیگ کی زبانی ہے کہ نواب علاؤ الدین خاں سے کہہ چکے کہ قصہ مٹ گیا ہے۔اب تم شوق سے دلی جاؤ۔وہ ہفتے سے لے کر دو مہینے تک کی تم کو رخصت ہے ۔پھر تم کیوں نہ آئے خدا نے دعا، خداوند نے استدعا قبول کی۔تمہاری طرف سے سست قدمی اور دل سردی کی کیا وجہ؟ اگر خاکی کی حکایت جھوٹی ہے تو تم سچ لکھو کہ ماجرا کیا ہے؟

مرزا یوسف علی خاں عزیز تمہارے بلائے ہوئے اور مہدی حسین بھائی صاحب کے مطلوب ،مرزا عبدالقادر بیگ کے قبائل کے ساتھ کل روانہ لوہارو ہوئے۔

شنبہ ۷ ستمبر ۱۸۶۴ء

نجات کا طالب، غالب

مرزا علائی مولائی!

نہ لاہور سے خط لکھا، نہ لوہارو سے، بقدر مادۂ حمق محوِ انتظار بلکہ امیدوار رہا۔ اب جو کسی طرح کی توقع نہ رہی تو شکوہ طرازی کا موقع ہاتھ آیا۔ اگر چہ جانتا ہوں کہ ایک شکوہ کے دفع میں طوطی نامہ برابر ایک رسالہ لکھو گے اور ہزاروجہیں موجہ بیان کرو گے۔ میں اس تصور کا مزہ اٹھا رہا ہوں کہ دیکھوں کیا لکھتے ہو۔

دادی صاحبہ سے لکھوانا، پھوپھی صاحبہ سے لکھوانا۔ غالب سے لکھوانا، بعد حصول اجازت نہ آنا۔ اس کے بھی کچھ معنی ہیں یا نہیں۔ اچھا میرا میاں۔ کچھ اس باب میں لکھ۔ چپڑی اور دو دو۔ ایک مندیل اور ایک سیلا کوئی اور چیز مبارک،

بچوں کو میری دعا کہنا اور ان کی خیر و عافیت رکھنا۔ استاد میر جان صاحب کو سلام مزا تو جب ملے گا کہ تم دلی آؤ اور اپنی زبان سے لاہور کے ہنگامہ انجمن کا حال بیان کرو۔

چہار شنبہ ۳ نومبر ۱۸۶۴ء

نجات کا طالب غالب

---

[۱] یعنی علی بخش خاں کو [۲] نواب امین الدین احمد خاں [۳] حاکی، حکایت کرنے والا [۴] مجروح

میری جان!

تمہارا خط بھی آیا اور علی حسین خاں نجم الدین بھی تشریف لایا۔ اگر سرنوشت آسمانی میں بھی اوخر رجب یا اوائل شعبان میں ہمارا تمہارا مل بیٹھنا مندرج ہے تو زبانی کہہ سن لیں گے۔ قلم کو ان اسرار کی محرمیت نہیں ہے جو شخص اپنے ملک و مال جان و تن و ننگ و نام کے امور میں اشفتہ و سرگرداں بلکہ عاجز و حیران ہو، دوسرے کو اس سے کیا گلہ؟ ہاے نظیری:

باما جفا و ناخوشی باخود غرور سرکشی
از مانہ ای، از خود نہ ای، آخر از آن کیستی

محل عقل وہ ہوش دماغ، سو تباہ، افیون کا تحمر ہوجانا علاوہ۔ اللہ جو چاہے سو کرے۔ ایسا پیارا باغ و بہار، بھائی، یوں بگڑ جائے۔

۹۔ رجب ۱۲۸۱ھ، ۹ دسمبر ۱۸۶۴ء

نجات کا طالب غالب

لو صاحب، وہ مرزا جب بیگ میرے، ان کی تعزیت آپ نے نہ کی۔ شعبان بیگ پیدا ہو گئے، کل ان کی چھٹی ہو گئی، آپ شریک نہ ہوئے۔

اے وائے ز محرومی دیدار و دگر ہیچ

میاں، خدا جانے کس طرح یہ چار سطریں تجھ کو لکھی ہیں۔ شہاب الدین خاں کی بیماری نے میری زیست کا مزہ کھو دیا۔ میں کہتا ہوں کہ اس کے عوض میں مر جاؤں اللہ اس کو جیتا رکھے۔ اس کا داغ مجھ کو نہ دکھائے۔ یا رب اس کو صحت دے، یا رب اس کی عمر بڑھا دے تین بچے۔ ایک اب پیدا ہونے والا ہے۔ یا رب اس کو اولاد کے سر پر سلامت رکھ۔

۷ شعبان ۱۲۸۱ھ، ۵ جنوری ۱۸۶۵ء

نجات کا طالب، غالب

(۴۴)

میری جان، نا سازی روزگار و بے ربطی اطوار بطریق داغ بالائے داغ، آرزوے دیدار وہ دوآتش شرارہ بار اور یہ ایک دریائے ناپید کنار۔ دقنا ربنا عذاب النار۔

خدا نے بھائی ضیاءالدین خاں کے بڑھاپے اور میری بیکسی پر رحم فرمایا۔ میرا شہاب الدین خاں بچ گیا۔ امراض مختلفہ میں گھر گیا تھا۔ بواسیر خونی، زحیر، تپ، صداع بارے اب من کل الوجوہ صحت حاصل ہے۔ ضعف جاتے ہی جائے گا۔ آگے کون قوی تھے کہ اب ان کی ضعف کہا جائے ایک بڈھا کسی گلی میں جاتے جاتے ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ کہنے لگا، ہائے بڑھاپا۔ ادھر ادھر دیکھا۔ جب جانا کوئی نہیں ہے کہتا ہوا بڑھا کہ، جوانی میں کے پتھر پڑے تھے۔ والسلام

جنوری ۱۸۶۵ء

غالب مستہام[۲]

---

[۱] یعنی رجب ختم ہوگیا۔ شعبان کے مہینے کی چھٹی تاریخ ہے [۲] سرگشتہ و حیراں

میری جان!

نئے مہمان کا قدم تم پر مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ تمہاری اور اس کی اور اس کے بھائیوں کی عمر و دولت میں برکت دے۔ تمہاری طرز تحریر سے صاف نہیں معلوم ہوتا کہ سعید اہے۔ ثاقب اس کو عزیز اور غالب رعزیز جانتا ہے۔ واضح لکھوتا کہ احتمال رفع ہو۔ خط ثاقب کے نام کا۔ تو بتو یہ خط کا ہے کو ایک تختہ کاغذ کا۔ میں نے سراسر پڑھا۔ لطیفہ و بدلہ و شوخی و شوخ چشمی کا بیان جب کرتا کہ فحوائے عبارت سے خون جگر نہ جاتا۔ بھائی کا غم جدا۔ ایسا سخن گزار، ایسا زبان آور۔ ایسا عیار طرار، یوں عاجز و درماندہ و از کار رفتہ ہو جائے، تمہارا غم جدا۔ ساغر اول و دور۔ کیا دل لے کر آئے۔ کیا زبان لے کر آئے۔ کے علم لے کر آئے۔ کیا عقل لیکر آئے۔ اور پھر کسی روش کو برت نہ ہو سکے۔ کسی شیوہ کی دوا نہ پائی۔ گویا نظیری تمہاری زبان سے کہتا ہے۔

جو ہر بنیش من در تہ زنگار بماند
آنکہ آئینہ من ساخت ، نہ پرداخت دریغ

بھائی اس معرض میں، میں بھی تیرا ہم طالع اور ہم درد ہوں۔ اگر چہ یک فنہ ہوں۔ مگر مجھے اپنے ایمان کی قسم۔ میں نے اپنی نظم ونثر کی داد باندازہ بایست پائی نہیں۔ آپ ہی کہا۔ آپ ہی سمجھا قلندری و آزدگی و ایثار و کرم کے جو داعیہ میری خالق نے مجھ میں بھر دیئے ہیں۔ بقدر ہزار یک۔ ظہور میں نہ آئے۔ نہ وہ طاقت

جسمانی کہ ایک لاٹھی ہاتھ میں لوں اور اس میں شطرنجی اور ایک ٹین لالوٹا مع سوت کی رسی کے لٹکا لوں اور پیادہ پا چل دوں ۔ کبی شیراز جا نکا۔ کبھی مصر میں جا ٹھہرا، کبھی نجف میں جا پہنچا، نہ وہ دستگاہ کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے تو نہ سہی ۔ جس شہر میں رہوں ۔ اس شہر میں تو بھوکا ننگا نظر نہ آ ے ۔ ۱؎

نہ بستا ن سرائے، نہ میخانہ

نہ دستاں سرایے نہ جانا نہ

نہ رقص پری پیکراں بر بساط

نہ غوغا ے رامشگراں دربارط

خدا کا مقہور، خلق کا مردود، بوڑھا، ناتواں بیمار، فقیر نکبت میں گرفتار، تمہارے حال میں غور کی اور چاہا کہ اس کا نظیر بہم پہنچاؤں، واقعہ کربلا سے نسبت نہیں دے سکتا، لیکن واللہ تمہارا حال اس ریگستان میں بعینہ ایسا ہے جیسا مسلم بن عقیل کا حال کوفہ میں تھا۔ تمہارا خالق تمہاری اور تمہارے بچوں کی جان و آبرو کا نگہبان ۔ میرے اور معاملات کلام و مال سے قطع کرو، وہ جو کسی کو بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے ۔ اور خود در بدر بھیک مانگے ۔ وہ میں ہوں ۔

صبح دوشنبہ شانزدہم از مہ صیام ۱۲۸۱ھ (۱۳ فروری ۱۸۶۵ء)

۱؎ لڑکی ہے یا لڑکا: ۲؎ ہم درد سے مراد غمگسار نہیں بلکہ جو درد تمہیں ہے وہی مجھے ہے۔ ۳؎ جیسے پانی چاہیے تھی ۴؎ جمع داعیہ یعنی ارادے، آرزوئیں، ۵؎ قدرت ۶؎ منشی مہیش پرشاد نے یہاں آئے کی جگہ آؤں بنایا ہے لیکن ترمیم کی مناسبت سمجھ میں نہ آئی دنیا کے میزبان بننے سے صاف ظاہر ہےکہ غالب لوگوں کو کھلاتا اور ضروریات زندگی سے

فارغ کرنا چاہتے تھے۔ خود بھوکا ننگا نظر نہ آؤں‘‘ میں نہ داعیہ ایثار و کرم ہے نہ شان میزبانی، یہاں ’’آئے ہی صحیح ہے۔

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

صاحب!

کل تمہارا خط پہنچا۔ آج اس کا جواب لکھ کر روانہ کرتا ہوں۔ رجب بیگ، شعبان بیگ، رمضان بیگ یہ نامور مہینے ہیں۔ سو خالی گئے، شوال بیگ آدمی کا نام سنا۔ ہاں عیدی بیگ ہوسکتا ہے۔ پس جب عید ہے اور روز سعید ہے تو کیا بعید ہے کہ بخلاف شہور ثلاثہ ماضیہ اس مہینے میں تم آسکو، ہے ہے۔ میں تو کہتا ہوں نہ آسکو۔ اس ماہ مبارک میں امضائے حکم سرکار کا وہ ہنگامہ گرم ہو کر پارسیوں کی عید کو سہ برشنبہ کا گماں گزرے۔ دور کیوں جاؤ ہولی دھلینڈی کا سماں لوہارو میں بندھ جائے۔ ایک خرسوار کی سواری بڑی دھوم سے نکلے۔ حسن اتفاق یہ کہ وہی موسم ہے۔ ہولی اور عید کو سہ برشنبہ۔ کا زمانہ باہم ہے۔ حوت کے آفتاب میں یہ دونوں تہوار ہوتے ہیں۔ کل آفتاب حوت میں آیا ہے کہ سہ برشنبہ اور ہولی کا مژدہ لایا ہے۔ خیر میں چند روز اور کشمکش فراق اور تیرے دیدار کا مشتاق ہوں۔ تو کو سہ برشنبہ اور ہولی کی رنگ رلیاں منالے اور خرسوار ہو کر بغرب تازیانہ دوڑالے۔

علاؤالدین کاں؟ واللہ تو میرا فرزند روحانی معنوی ہے۔ فرق اسی قدر ہے کہ میں جاہل ہوں اور تو مولوی ہے۔ ارے ظالم، اس کو سہ برشنبہ کی داد دے۔ عقل ۔ کرامت ہے۔ الہام ہے لطف طبع ہے۔ کیا ہے؟ یہ اسم کس قدر مناسب مقام ہے۔

صبیہ کا مقدم تم پر مبارک ہو۔ ثاقب مجھ سے لڑتا تھا کہ بھتیجا ہے۔ میں کہتا تھا

کہ پوتی ہے۔ بارے میں جیتا اور ثاقب ہارا، عریضہ جداگانہ استاد میر جان صاحب کے نام پہنچتا ہے۔

پنجشنبہ ۲۶ رمضان ۱۲۸۱ء

غالب

مطابق ۲۳ فروری ۱۸۶۵

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
Dr.M.M.M
©2002-2006

(۴۷)

شکر ایزد کہ ترا با پدرت صلح فتاد
حوریاں رقص کناں ساغر شکرانہ زوند
قدسیاں بہر دعائے تو و ولا پدرت
قرعۂ فال بنام من دیوانہ زوند ؎

میاں، تم جانتے ہو کہ میں عازم رام پور تھا۔ اسباب مساعد ہو گئے۔ بشرط حیات جمعہ کو روانہ ہوں گا۔ لڑکے بالوں کی خیر و عافیت علی حسین خاں کی تحریر سے معلوم ہوتی رہتی ہے۔ میرا لکھنا زائد ہے۔ ایک بار میں صاحب کمشنر کی عیادت کو گیا تھا۔ فرخ مرزا بھی میرے ساتھ گیا تھا۔ مزاج کی خبر پوچھ آیا۔ بھائی کو میرا سلام کہنا۔

یک شنبہ یکم اکتوبر ۱۸۶۵ء

راقم غالب علی شاہ

۱؎ یعنی ان مہینوں میں نہ آئے ۲؎ کوسہ برنشیں پارسیوں کا ایک جشن تھا جس کی کیفیت یہ ہے کہ کوسہ یعنی ایسے آدمی کو جس کے بڑی عمر تک ڈاڑھی نہ نکلے۔ تلاش کر کے گدھے پر سوار کرتے۔ ایک ہاتھ میں پنکھا اور دوسرے میں کوڑا دے دیتے۔ اس کے بدن پر گرم دوائیں مل دیتے اور وہ ہائے گرمی ہائے گرمی کہتا۔ پھر تیزی سے پنکھا جھلنے لگتا۔ امیر غریب سب اس کے گرد جمع رہتے۔ کوئی اس پر پانی ڈالتا، کوئی برف پھینکتا، جب وہ سردی کے مارے کانپنے لگتا تو کوڑا گھماتا۔ لوگ اس کی

چوٹیں کھاتے اور ہنستے۔ جس دکان سے جو چیز چاہتا اٹھالیتا بلکہ لوگ نذرانے لیکر دروازوں پر کھڑے رہتے۔ ۳؎ ہولی کا دوسرا دن جس میں دھول اڑائی جاتی ہے۔ ۴؎ دونوں شعروں کے آخر مصرے خواجہ حافظ کے ہیں ابتدائی مصرعوں میں حسب ضرورت ترمیم کرلی گئی ہے۔

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

جانا عالی شانا!

خط پہنچا، خط اٹھایا۔ تمہاری آشفتہ حالی میں ہرگز شک نہیں، تم کہیں، قبائل کہیں۔ والی شہر ناساز گار، انجام کار ناپایدار، ایک دل اور سو آزار۔ اللہ تمہارا یاور، علی تمہارا مددگار، میں پا در رکاب، بلکہ نعل و آتش، کب جاؤں اور فرخ سیر کو دیکھوں۔ ایک خط میں نے علی حسین خاں کو لکھا۔ وہاں سے اس کا جواب آ گیا۔ روہیلا پھوڑے پھنسی میں مبتلا ہے۔ خدا اس کو صحت دے۔ شمشاد علی بیگ کہاں اور پہنچا اور اس طرح گیا کہ شہاب الدین خاں سے مل کر بھی نہ گیا۔ خیر:

رموز مصلحت خویش خسرواں و انند

یہاں جشن کے وہ سامان ہو رہے ہیں کہ جمشید اگر دیکھتا تو حیران رہ جاتا۔ شہر سے دو کوس کے فاصلے پر آغا پور نامی ایک بستی ہے آٹھ دس دن سے وہاں خیام برپا تھا۔ پرسوں صاحب کمشنر بہادر بریلی مع چند صاحبوں اور میموں کے آئے اور خیموں میں اترے کچھ کم سو صاحب اور میم جمع ہوئے۔ سب سرکار رامپور کے مہمان۔ کل سہ شنبہ ۵ دسمبر، حضور پر نور بڑے تجمّل سے آغا پور تشریف لے گئے۔ بارہ پر دو بجے گئے اور شام خلعت پہنچ کر آئے۔ وزیر علی خاں، خانساماں، خواصی میں سے روپیہ پھینکتا ہوا آتا تھا۔ دو کوس کے عرصے میں دو ہزار سے کم نثار ہوا ہوگا۔ آج صاحبان عالی شان کی دعوت ہے۔ چٹن، شام کا کھانا یہیں کھائے گے۔ روشنی، آتشبازی کی وہ افراط کہ رات دن کا سامنا کرے گی۔ طوائف کا وہ

ہجوم، احکام کا وہ مجمع کہ اس مجلس کو طوائف الملوک کہا چاہیے۔ کوئی کہتا ہے کہ صاحب کمشنر بہادر، مع صاحبان عالی شان کے کل جائیں گے کوئی کہتا ہے پرسوں۔ رئیس؎ کی تصویر کھینچتا ہوں۔ قد، رنگ شکل، شمائل بعینہ ضیاؤالدین خاں، عمر کا فرق اور کچھ کچھ چہرہ اور لحیہ متفاوت، حلیم، خلیق، باذل کریم متواضع متشرع، متورع ہے، شعر فہم، سیکڑوں شعر یاد، نظم کی طرف توجہ نہیں۔ نثر لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں۔ جلالاے طبا طبائی کی طرز برتتے ہیں۔ شگفتہ جبیں ایسے کہ ان کے دیکھنے سے غم کوسوں بھاگ جائے۔ فصیح بیان ایسے کہ ان کی تقریر سن کر ایک اور نئی روح قالب میں آئے۔ اللہم دام اقبالہ، و زاد اجلالہ۔ بعد اختتام محافل طالب رخصت ہوں گا۔ بعد حصول رخصت دلی جاؤں گا۔ بھائی صاحب؎ کی خدمت میں بشرط رسائی وتاب گویائی سلام کہنا اور بچوں کی خیر و عافیت جو تم کو معلوم ہوئی ہے۔ وہ مجھ کو لکھنا، ۶ دسمبر ۱۸۶۵ء کی، بدھ کا دن، آٹھ بجا چاہتے ہیں۔ کاتب کا نام غالب ہے کہ تم جانتے ہوگے۔

۶ دسمبر ۱۸۶۵ء

(۴۹)

مرزا،

روبرو بہ از پہلو آو، میرے سامنے بیٹھ جاو، آج صبح کے سات بجے باقر علی خاں اور حسین علی خاں مع چودہ مرغ، چھ

۱؎ یہ خط رام پور سے لکھا گیا تھا اور اس میں نواب کلب علی خاں کے جشن جانشینی کا ذکر ہے۔ ۲؎ نواب کلب علی خاں۔ ۳؎ پابند شریعت اور پرہیز گار۔ ۴؎ امین الدین خاں

بڑے اور آٹھ چھوٹے کے، دلی کو روانہ ہوئے۔ دو آدمی میرے ان کے ساتھ، گئے۔ کلو اور لڑکا نیاز علی یعنی ڈیڑھ آدمی میرے پاس ہیں۔ نواب صاحب نے بوقت رخصت ایک ایک دو شالہ مرحمت کیا۔ مرزا نعیم بیگ ابن مرزا کریم بیگ دو ہفتے سے یہاں وارد ہیں اور اپنی بہن کے ہاں ساکن ہیں۔ کہتے ہیں کہ تیرے ساتھ دلی چلوں گا اور وہاں سے لوہارو جاؤں گا۔ میرے چلنے کا حال یہ ہے کہ ان شاء اللہ اسی ہفتہ چلوں گا۔

آپ چال چوکے۔ اردو لکھتے جو خط مشتمل ایک مطلب پر تھا، اس کو تم نے فارسی میں لکھا اور فارسی میں مقصد یا نہ کہ امیر کو اور اپنے بزرگ کو کبھی بصیغہ مفرد نہ لکھیں۔ یہ وہی چھوٹی ہے بڑی ہے کا قصہ ہے۔ خیر خط نہ دکھاؤں گا۔ ما کتب فیہ کہہ کر کام نکال لوں گا۔ میں نے چلتے وقت فرخ سیر کیا تالیق کی زبانی بھائی کو کہلا بھیجا تھا کہ تم اگر کوئی اپنا مدعا کہو تو میں اس کی درستی کرتا لاؤں۔ جواب آیا کہ اور کچھ مدعا نہیں، صرف مکانوں کا مقدمہ ہے۔ سو اس مقدمہ میں میرا اور میرے شرکاء

وکیل وہاں موجود ہے۔ اگر وہ اس امر کا ذکر کرتے تو میں ان سے ان کے خالو علی اصغر خاں کے نام عرضی یا خط لکھوالاتا۔ بہر حال اب بھی قاصر نہ رہوں گا۔ تاریخ اوپر لکھ آیا۔ نام اپنا بدل کر مغلوب رکھ لیا ہے۔

بھائی سے دو سوال ہیں۔ ایک تو یہ کہ مجموعہ نثر کو کیا کروں؟ وہ مبنیب تھا اس حقیقت پر کہ نول کشور نواب ضیاء الدین احمد خاں سے واسطے انطباع کے لے گیا۔ جب یہ واقع نہ ہوا تو اس کو نکال ڈالوں اور اس کی جگہ جو نئی نثریں اور ہیں۔ وہ لکھ دوں؟

اوراق اشعار مرحومی زین العابدین خاں مستعار ہیں اس واسطے کہ تم اپنے ہاں کے مجموعے کی تصحیح اس سے کرلو، پھر امر واقع ہوا ہونیوالا ہے؟ ترجمہ ابو الفدا رکی جلد واپسی پہنچتی ہے۔

جمعہ ۲۲۔ دسمبر ۱۸۶۵ء۔ دو بجے تین کا عمل

جواب کا طالب غالب

۱۔ باقر علی خاں اور حسین علی خاں پسران عارف ؒعلیل

---

(۵۱)

میاں!

چلتے وقت تمہارے چچا نے غلیل کی فرمایش کی تھی۔ رام پور پہنچ کہ وہ بے سعی و تلاش ہاتھ آ گئی۔ بنوا رکھی، لڑکوں نے ملازموں نے، سب نے مجھ سے لیا کہ یہ نواب ضیاء الدین خاں کے واسطے ہے۔ اب چلنے سے ایک ہفتہ پہلے تم نے غلیل مانگی، بھائی کیا بتاؤں کہ کتنی جستجو کی، بہم نہ پہنچی، دس روپے تک کو مول نہ ملی۔ نواب صاحب سے مانگی، توشہ خانہ میں بھی نہ تھی۔ ایک امیر کے ہاں پتا لگا دوڑا ہوا گیا۔ کھپچی موجود پائی، لیکن کیا کھپچی؟ جیسے نجف خاں کے عہد کے تو رانیوں میں ہماری تمہاری ہڈی۔ بنوانے کی فرصت کہاں؟ آج لی، کل چل دیا۔ اس بانس کی قدر کرنا اور اس کو اچھی طرح بنوالینا۔ بادشاہ فرخ سیر اور اس کے اخوان خوش وخرم ہیں۔ فرخ سیر کی ماں نے باجرے کا حلوہ سوہن کھلایا۔

شنبہ ۲۵ شعبان ۱۲۸۲ھ مطابق ۳ جنوری ۱۸۶۶ء نجاب کا طالب

غالب

صاحب!

خط تمہارا پہنچا، مطالب دل نشین ہوئے۔ غوغائے خلق سے مجھ کو غرض نہیں۔ کیا اچھی رباعی ہے کسی کی،

مومن بخیال خویش مستم داند
کافر بگماں خدال پرستم داند
مروم ز غلط فہم مردم مردم
اے کاش کے ہر آنچہ ہستم، داند

بھائیوں[۲] سے پھر نہیں ملا، بازار میں نکلتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ جواہر خبردار[۳] میرا سلام اخوین کو اور ان کا سلام مجھ کو پہنچا دیتا ہے۔ اسی کو غنیمت جانتا ہوں۔

تاب لائے ہی بنے گی غالب
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز
ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دن نکلے
بہت نکلے میرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

یہ مطلع اور مقطع مندرجہ ایوان ہے مگر اس وقت یہ دونوں شعر حسب حال نظر آئے۔ اس واسطے لکھ دیے گئے۔ تم نے اشعار جدید مانگے۔ خاطر تمہاری عزیز، ایک مطلع، صرف دو مصرے آگے کے کہے ہوئے یاد آ گئے کہ وہ داخل دیوان بھی نہیں۔ ان پر فکر کر کے ایک مطلع اور پانچ شعر لکھ کر سات بیت کی ایک غزل کو بھیجتا

ہوں۔ بھائی کیا کہوں کہ کس مصیبت سے یہ چھ بیتیں ہاتھ آئی ہیں اور وہ بھی بلند رتبہ نہیں:

بہت سہی غم گیتی شراب کم کیا ہے
غلام ساقی کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے

رقیب پر ہے اگر لطف تو ستم کیا ہے ؟
تمہاری طرز و روش جانتے ہیں ہم ، کیا ہے؟

کٹے تو شب کہیں، کاٹے تو سانپ کہلائے
کوئی بتاؤ کہ وہ زلف خم بہ خم کیا ہے ؟

لکھا کرے کوئی احکام طالع مسعود
کسے خبر کہ وہاں جنبش قلم کیا ہے ؟

نہ حشر و نشر کا قائل نہ کیش و ملت کا
خدا کے واسطے ایسے کی پھر قسم کیا ہے؟

۱۔ علی اصغر علی خاں جن کا ذکر پہلے خط میں ہے، لیکن کماں نہ ملی صرف کھپچی ملی یعنی کمان بنانے کا بانس۔ ۲۔ بھائیوں سے مراد امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں ہیں۔ ۳۔ غالباً چوکیدار کا نام ہے۔

وہ داد و دید گرانمایہ شرط ہے ہمدم
وگرنہ مہر سلیمان و جام جم کیا ہے؟

سخن میں خامہ غالب کی آتش افشانی
یقین ہے ہم کو بھی لیکن اب اس میں دم کیا ہے ؟

لو صاحب تمہارا فرمان قضا توامان بجا لایا مگر اس غزل کا مسودہ میرے پاس نہیں ہے۔ اگر یہ احتیاط رکھو گے اور دیوان کے حاشیے پر چڑھاؤ گے تو اچھا کرو گے۔ عمر فراوان اور دولت زیادہ، فقط

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

(۵۳)

سعادت و اقبال نشان مرزا علاؤالدین خاں بہادر کو فقیر اسد اللہ کی دعا پہنچے۔ کل شام کو مخدوم مکرم جناب آغا محمد حسین صاحب شیرازی، بسواری رل، مانند دولت، دل خواہ ناگاہ آئے، فقیر کے تکیہ میں تشریف لائے۔ شب کو جناب ڈپٹی ولایت حسین خان کے مکان میں آرام فرمایا۔ اب وہاں سے آتے ہیں۔ قریب طلوع آفتاب، بہ چشم نیم باز، یہ رقعہ تمہارے نام لکھا ہے۔ جو کچھ جی چاہتا ہے۔ وہ مفصل نہیں لکھ سکتا۔ مختصر مفید آغا صاحب کو دیکھ کر یوں سمجھنا کہ میرا بوڑھا چچا غالب جوان ہو کر میلے کی سیر کو حاضر ہوا۔ پس نور چشمان راحت جان مرزا باقر علی خاں۔ بہادر مرزا علی حسین خاں بہادر، جناب آغا صاحب کا قدمبوس بجا لائیں۔ ان کی خدمت گزاری کو اپنی سعادت اور میری خوشنودی سمجھیں۔ بس۔

ہاں۔ مرزا علائی، اگر کرنیل الگزنڈر اسکنہ بہادر سے ملاقات ہو تو میرا اسلام کہنا۔

غالب

میاں،

مدعا اصلی ان سطور کی تحریر سے یہ ہے کہ اگر کل کمیٹی میں گئے ہو، تو میرے سوال کے پڑھے جانے کا حال لکھو، ضمناً ذکر ایک مدبر کا لکھا جاتا ہے۔ جو تم نے اس مدبر کے صفات لکھے۔ سب سچ ہے۔ احمق خبیث النفس، حاسد، طبیعت بری، سمجھ بری، قسمت بری، ایک بار میں نے دکنی کی دشمنی میں گالیاں کھائیں۔ ایک بار بنارسی کی دوستی میں گالیاں کھاؤں گا۔ میں نے جو تمہیں اس کے باب میں لکھا تھا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ میں نے سنا تھا کہ تم نے اپنے سائیسوں سے کہہ دیا یا کہا چاہتے ہو کہ اس کو بازار میں بے حرمت کریں۔ یہ خلاف شیوہ مومنین ہے، خلاصہ یہ کہ یہ قصدہ نہ کرنا۔ یہ موید، اس قول کا ہے۔ جو میں نے تم سے پہلے کہا تھا کہ تم یوں تصور کرو کہ اس نام کا آدمی اس محلے میں، بلکہ اس شہر میں کوئی نہیں ہے۔

غالب

(۵۵)

صاحب!

بہت دن سے تمہارا خط نہیں آیا۔ آپ کا وکیل بڑا چرب زبان ہے۔ مقدمہ اس نے جیت لیا۔ چنانچہ اس کی تحریر سے تم کو معلوم ہوا ہوگا۔ سنتا ہوں کہ حمزہ خاں کو ان دنوں علت مشائخ کا زور ہے۔ اور سعدیؒ کی اس بات پر عمل کرتے ہیں:

کسانیکہ	یزداں	پرستی	کنند
بآواز	دو	لاب	مستی کنند

خدا مبارک

غالب

۱؎ غالباً اس زمانے میں دونوں لوہار گئے ہوئے تھے۔ ب۲؎ معلوم نہیں اس خط کس کی طرف اشارہ ہے۔ دکنی سے مراد میرزا حسین صاحب برہان قاطع ہے۔ بناری کے متعلق کچھ علم نہ ہوسکا۔

Iqbal Cyber Library. All rights reserved. ©2002-2006

(۵۶)

میاں، تمہارے باپ کا تابع تمہارا مطیع، فرخ میرزا کا فرمانبردار، مگر ابھی اٹھا ہوا۔ اپنے کو بھی نہیں سمجھا کہ میں کون ہوں۔ آج فرخ صاحب کے نام رقعہ پہنچ جائیگا۔ چھ جز تمہارے دیے ہوئے اور باقی دن چڑھے اعیان مطبع جمع ہولیں تو وہ اوراق بھی منگا دوں۔

غالب

(۵۷)

اقبال نشان والاشان، صدر عزیز تر راز جان، مرزا علاؤ الدین خاں کو دعاے درویشانہ غالب دیوانہ پہنچے۔ سال نگارش تم کو یاد ہوگا۔ میں نے، بستان فارسی کا تم کو جانشین اور خلیفہ قرار دے کر ایک سجل لکھ دیا ہے۔ اب جو چار کم اسی برس کی عمر ہوئی اور جانا کہ میری زندگی برسوں کیا بلکہ مہینوں کی نہ رہی،۔ شاید بارہ مہینے جس کو ایک برس کہتے ہیں اور جیوں ورنہ دو چار مہینے پانچ سات ہفتے دس بیس دن کی بات رہ گئی ہے۔ اپنے اثبات حواس میں اپنے دستخط سے یہ توقیع تم کو لکھ دیتا ہوں کہ فن اردو میں نظماً ونثراً تم میرے جانشین ہو۔ چاہیے کہ میرے جاننے والے جیسا مجھ کو جانتے تھے۔ ویسا تم کو جانیں اور جس طرح مجھ کو مانتے تھے، تم کو مانیں کل شئی ھالک الا وجہہ ویبقی وجہ ربک ذی الجلال والاکرام

یک شنبہ سلخ صفر ۱۲۸۵ھ

۲۱ جون ۱۸۶۸ء من مقام دہلی

نواب ضیاء الدین احمد خاں صاحب بہادر

جناب قبلہ و کعبہ

آپ کو دیوان کے دینے میں تامل کیوں ہے؟ روز آپ کے مطالعہ میں نہیں رہتا۔ بغیر اسکے دیکھے آپ کو کھانا ہضم نہ ہوتا، یہ بھی نہیں۔ پھر آپ کیوں نہیں دیتے؟ ایک جلد ہزار جلد بن جائے۔ میرا کلام شہرت پائے۔ میرا دل خوش ہو۔ تمہاری تعریف کا قصیدہ اہل عالم دیکھیں، تمہارے بھائی کی تعریف کی نثر سب کی نظر سے گزرے۔ اتنے فوائد کیا تھوڑے ہیں رہا کتاب کے تلف ہونیکا اندیشہ یہ خفقان ہے۔ کتاب کیوں تلف ہوگی؟ احیاناً اگر ایسا ہوا ن اور دلی لکھنو کی عرض راہ میں ڈاک لٹ گئی، تو فوراً بہ سبیل ڈاک رام پور جاؤں گا اور نواب فخر الدین خاں مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیوان تم کو لا دونگا۔

اگر یہ کہتے ہو کہ اب وہاں سے لیکر بھیج دو وہ نہ کہیں گے کہ وہیں سے کیوں نہ بھیجے؟ ہاں یہ لکھوں کہ نواب ضیاء الدین خاں صاحب نہیں دیتے، تو کیا وہ نہیں کہہ سکتے کہ جب وہ تمہارے بھائی اور تمہارے قریب ہو کر نہیں دیتے۔ تو میں اتنی دور سے کیوں دوں۔ اگر تم یہ کہتے ہو کہ تفضل سے لے کر بھیج دو۔ وہ اگر نہ دیں تو میں کیا کروں۔ اگر دیں تو میرے کس کام کا؟ پہلے تو نا تمام، پھر ناقص، بعض بعض قصائد اس میں سے اور کے نام کر دیے گئے ہیں اور اس میں اسی ممدوح سابق کے نام پر ہیں۔ شہاب الدین خاں کا دیوان جو یوسف میرزا لے گیا ہے۔ اس میں یہ دونوں قباحتیں موجود، تیسری یہ کہ سراسر غلط، ہر شعر غلط، ہر مصرع غلط، یہ کام تمہاری

مدد کے بغیر انجام نہ پائے گا اور تمہارا کچھ نقصان نہیں۔ ہاں احتمال نقصان وہ بھی از روے وسوسہ دو ہم، اس صورت میں میں تلافی کا کفیل، جیسا کہ اوپر لکھ آیا ہوں۔ بہر حال راضی ہو جاؤ تو طالب کو اطلاع دوں اور طلب اس کی جب دوبارہ ہو تو کتاب بھیج دوں۔[1]

رحم و کرم کا طالب،

غالب

---

[1] ۱۲۸۵ھ میں غالب کی عمر ۷۳ برس کی تھی۔ معلوم نہیں اسے کس حساب سے ۷۹ برس بنا دیا۔ میرا خیال ہے اصل لفظ چار نہیں سات ہوگا۔ غلطی سے چار پڑھا گیا اور یہی رائج رہا۔[2] گویا یہ سند وفات سے کم و بیش نو مہینے پہلے لکھی تھی۔[3] ضیاء الدین احمد خاں عمر میں میرزا غالب سے چھوٹے تھے۔ لیکن انہیں قبلہ و کعبہ غالباً اس وجہ سے لکھا کہ صاحب علم و امارت تھے۔ یہاں دیوان سے مراد فارسی کلیات نظم کا نسخہ ہے۔

میرزا شہاب الدین احمد خاں ثاقب

بھائی!

تمہارا خط حکیم محمود خاں صاحب کے آدمی کے ہاتھ پہنچا۔ خیر و عافیت معلوم ہوئی۔ انصاف کرو، کتاب کوئی سی ہو۔ اس کا پتا کیوں کر لگے؟ لوٹ کا مال چوری چوری کرنے کھتروں ۲؎ میں بک گیا اور اگر سڑک پر بھی بکا تو میں کہاں دیکھوں؟ صبر کرو اور چپ ہو رہو۔

بر دل نفس اندہ گیتی بسر آرید
گیرید کہ گیتی ہمہ یکسر بسر آمد

آدمی تو آتے جاتے رہتے ہیں۔ خدا کرے یہاں کا حال سن لیا کرتے ہو۔ اگر جیتے رہے اور ملنا نصیب ہوا تو کہا جائیگا، ورنہ قصہ مختصر، قصہ تمام ہوا۔ لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں اور وہ بھی کون سی خوشی کی بات ہے جو لکھوں؟ اپنے گھر میں اور اپنے بچوں کو میری طرف سے دعا کہہ دینا اور تم کو بھی تمہاری ستانی دعا کہتی ہیں۔ زیادہ، زیادہ۔

دوشنبہ ۸۔ فروری ۱۸۵۸ء

از غالب

(۲)

بھائی شہاب الدین خاں، واسطے خدا کے، تم نے اور حکیم غلام نجف خاں نے میرے دیوان کا کیا حال کر دیا ہے۔ یہ اشعار جو تم نے بھیجے ہیں، خدا جانے کس ولد الزنا نے داخل کر دیے ہیں۔ دیوان تو چھاپے کا ہے، متن میں اگر یہ شعر ہوں تو میرے ہیں۔

اگر حاشیہ پر ہوں تو میرے نہیں ہیں۔ بالفرض اگر یہ شعر متن میں پائے بھی جائیں تو یوں سمجھنا کسی ملعون زن جاب نے اصل کلام کو چھیل کر یہ خرافات لکھ دیے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ جس مفسد کے یہ شعر اس کے باپ اور دادا پر لعنت اور وہ ہفتاد پشت تک والد الحرام، اس کے سوا اور کیا لکھوں؟

ایک تو لڑکے کے میاں غلام نجف، دوسرے تم، میری کم بختی بڑھاپے میں آئی کہ میرا کلام تمہارے ہاتھ پڑا۔ بعد ان سطروں کے لکھنے کے تمہارا خط پہنچا۔ یہ دوسرا حادثہ مجھ کو پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا۔ قضا قدر کے امور میں دم مارنے کی گنجائش نہیں ہے۔ کہیں جاگیر پر جانے کی اجازت جلد ہو جائے تاکہ سب یکجا باہم بآرام سے رہو۔ اپنے کاتب سے کہہ دینا کہ یہ خرافات متن میں نہ لکھے۔ اگر لکھ دیے ہوں تو وہ ورق نکلوا ڈالنا۔ اور ورق اس کے بدلے لکھوا کر لگوا دینا۔ مناسب تو یوں ہے، کہ تم کسی آدمی کے ہاتھ وہ دیوان جو تمہارے کاتب نے نقل کیا ہے، میرے پاس بھیج دو تاکہ میں ایک نظر اس کو دیکھ کر پھر تم کو بھیج دوں۔ زیادہ، زیادہ آج میرے پاس ٹکٹ ہے۔ نہ دام معاف رکھنا۔

والسلام

غالب

۱؎ اس خط پر کوئی تاریخ ثبت نہیں۔ بہ ظاہر ۱۸۶۰ء کا معلوم ہوتا ہے۔ جب کلیات نظم فارسی منشی نولکشور کے مطبع میں چھپوانے کا خیال آیا تھا۔ ۲؎ کھتر اسوراخ کو کہتے ہیں اور یہ لفظ کونے کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ مطلب یہ چھپ چھپا کر فروخت ہو گیا۔

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

(۳)

بھائی!

تمہارا خط پہنچا، کوئی مطلب جواب طلب نہیں تھا کہ میں اس کا جواب لکھتا۔ پھر سوچا کہ مبادا تم آزردہ ہو۔ اس واسطے آج یہ رقعہ تم کو لکھتا ہوں۔ میرا جی تو یہ چاہتا تھا کہ اب جو خط تمہیں لکھوں اس کے آغاز میں یہ لکھوں کہ مبارک ہو تمہارے ابوِعم مع الخیر جاگیر کو روانہ ہو گئے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ اب کے جو خط تم کو لکھوں گا۔ اس کا مضمون یہی ہو گا۔ خاطر جمع رکھنا اگر میرا خط دو چار دن نہ پہنچے تو مجھ کو اسی مضمون کے ظہور کا منتظر سمجھنا اور گلہ نہ کرنا۔ اور ہاں صاحب تم جو خط لکھتے ہو تو اس میں سعید احمد خاں کا کچھ ذکر نہیں لکھتے۔ لازم ہے کہ اس کی خیر و عافیت اور اسکی بہن کی خیر و عافیت لکھتے رہا کرو۔ یہاں تمہاری پھوپی اور دونوں بھتیجے اچھی طرح ہیں۔ والدعا۔

یک شنبہ ۱۲ اپریل ۱۸۵۸ء

از غالب

(۴)

تمہارے بھائی کا خط تمہارے پاس بھیجتا ہوں۔ کلیات اردو ۲؎ تم نے خرید ے ہیں ایک اس میں سے چاہو، اپنے
چچا کی نذر کرو، چاہو بھائی کو تحفہ بھیجو، میں نے اسوقت ان کے نام کا خط لوہارو کو روانہ کر دیا۔ بعد ارسال خط مولوی سدید الدین خاں صاحب، میرے ہاں آئے۔ اثنا حرف و حکایت میں میں نے، شاہین کی حقیقت پوچھی۔ جواب دیا کہ ہاں عربی میں ایک باجے کا نام شاہین ہے۔ بصورت اس کی پوچھی گئی۔ کہ کہ مجھے معلوم نہیں۔ صراح میں میں نے دیکھا ہے۔ فقط تم جو مولانا علائی کو خط لکھو، یہ رقعہ ملفوف کرو

غالب

۱؎ امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں غدر کے خاتمہ سے پہلے لوہارو روانہ ہو گئے تھے۔ مہر دلی میں ان کا سامان لوٹا گیا۔ دہلی مین مکانوں کو آگ لگا دی گئی۔ دو جانہ پہنچے۔ وہاں سے پکڑے آئے اور خاصی دیر تک قلعہ میں رہے۔ بے گناہ ثابت ہونے پر جولائی کے بعد انجیں جاگیر پر جانے کی اجازت ملی۔ اس خط میں اور اگلے خط میں انھیں اجازت مل جانیکی امید ظاہر کی گئی ہے۔ ۲؎ اس خط پر تاریخ درج نہیں۔ منشی مہیش پرشاد نے مارچ ۱۸۵۸ء کا بتایا ہے۔ قرینہ یقیناً یہی ہے کہ یہ خط مکتوب نمبر ا کے بعد اور مکتوب نمبر ۳ سے پہلے لکھا گیا۔ ۳؎ یعنی ضیاء الدین احمد خاں اور امین الدین احمد خاں ۴؎ سعید الدین احمد خاں غالب، برادر شہاب الدین احمد خاں چاقب، ۵؎ پھوپی سے مراد بیگم غالب، بھتیجوں سے مراد باقر علی خاں اور

حسین علی خاں ہیں۔ ۶؎ کلیات سے مراد اردو کا وہ ایوان ہے جو دہلی کے مطبع احمدی میں چھپا تھا تو یہ خط ۱۸۶۱ء کے نصف آخر میں لکھا گیا۔ اگر کانپور کے مطبع نظامی کا نسخہ مراد ہے تو پھر اسے ۱۸۷۲ء کا سمجھنا چاہیے

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

(۵)

نور چشم شہاب الدین خاں کو دعا کے بعد معلوم ہو۔ یہ جو رقعہ لیکر پہنچے ہیں، ان کا نام حسن علی ہے اور یہ سید ہیں۔ دوا سازی میں یگانہ رکاب داری میں یکتا۔ جان محمد انکا باپ ملازم سرکار شاہی تھا۔ اب ان کا چچا میر فتح علی پندرہ روپے مہینے کا الور میں نوکر ہے۔ بہر حال ان سے کہا گیا کہ پانچ روپیہ مہینہ ملے گا اور لوہارو جانا ہوگا۔ انکار کیا کہ پانچ روپیہ میں کیا کھاؤں گا۔ یہاں زن و فرزند کو کیا بھجواؤں گا۔ جواب دیا گیا کہ سرکار بڑی ہے۔ اگر کام تمہارا پسند آئے گا تو اضافہ ہو جائے گا۔ اب وہ کہتا ہے کہ خیر توقع پر یہ قلیل مشاہرہ قبول کرتا ہوں۔ مگر دونوں وقت روٹی سرکار سے پاؤں، بغیر اس کے کسی طرح نہیں جا سکتا۔

سنو میاں، حق بجانب اس غریب کے ہے۔ روٹی بغیر بات نہیں بنتی۔ یقین ہے تم رپورٹ کرو گے تو اس امر کی منظوری کا حکم آ جائیگا۔ یہ قصہ فیصل ہوا۔ اب یہ کہتا ہے کہ دو ماہ مجھے پیشگی دو تا کہ کپڑا لتا بناؤں اور کچھ گھر میں دے جاؤں۔ راہ میں روٹی اور سواری سرکار سے پاؤں۔ تو یہاں بھی حق بجانب سائل کے جانتا ہوں۔ مگر کچھ کہہ نہیں سکتا۔ خیر تم یہی میرا رقعہ اپنے نام کا علائی مولائی کو بھیج دو۔

سہ شنبہ ۲۴ ستمبر ۱۸۶۱ء

غالب

(۶)

میاں!

وہ قاضی تو مسخرہ ہے ان کا خط دیکھ لیا۔ خیر۔ ہاں، علاؤ الدین کا خط گھنٹہ بھر بھانڈ کے طائفے کا تماشا ہے۔ اب تم کہو استاد میر جان کو کیونکر بھیجو گے۔ انکو کہاں پاؤ گے۔ اور علاؤالدین خاں نے حسب الحکم تمہارے چچا کے لکھا ہے کہ آج لوہارو کی سواریاں آئی ہونی شاید کل یا پوسوں جئیں۔ اس کی فکر آج کرو۔ امین الدین خاں بے چارہ اکیلا گھبراتا ہوگا۔

"چکیدن وہیم" "رمیدن وپیہم" غزل علاؤ الدین کو بھیج چکا ہوں۔ تم علاؤ الدین خاں کو لکھو کے بڑے شرم کی بات ہے۔

"ہر دم آزردی غیر سبب راچہ علاج"

اس غزل کو حافظ کی غزل سمجھتے ہو۔ واہ واہ "غیر سبب یہ کہاں کی بولی ہے۔

"از خواندن قران تو قاری چہ فائدہ"

عیاذ اباللہ امیر خسرو" قرآن کو کہ بسکون راے قرشت والف ممدودو ہے۔ قران، بروزن پران لکھیں گے۔ یہ دونوں غزلیں دو گدھوں کی ہیں۔ شاید ایک نے مقطع میں حافظ اور ایک نے مقطع میں خسرو لکھ دیا ہو۔

(۷)

مرزا میاں شہاب الدین خاں اچھی طرح رہو۔ غازی آباد کا حال شمشاد علی سے سنا ہوگا۔ ہفتے کے دن دو تین گھڑی دن چڑھے احباب کو رخصت کر کے راہی ہوا۔ قصد یہ تھا کہ پلکھوے رہوں۔ وہاں قافلے کی گنجائش نہ پائی۔ ہاپوڑ کو روانہ ہوا۔ دونوں برخوردار گھوڑوں پر سوار پہلے چل دیے۔ چار گھڑی دن رہے ہیں ہاپوڑ کی سرائے میں پہنچا۔ دونوں بھائیوں کو بیٹھے ہوئے اور گھوڑوں کو ٹہلتے ہوئے پایا۔ گھڑی بھر دن رہے قافلہ آیا میں نے چھٹانک بھر گھی داغ کیا۔ دو شامی کباب اس میں ڈال دیے۔ رات ہوگئی تھی، شراب پی۔ کباب کھائے۔ لڑکوں نے ارہر کی کھچڑی پکوائی۔ خوب گھی ڈال کر آپ بھی کھائی اور سب آدمیوں کو بھی کھلائی۔ دن کے واسطے سادہ سالن پکوایا۔ ترکاری نہ ڈلوائی۔ بارے آج تک دونوں بھائیوں میں موافقت ہے آپس میں صلح و مشورت سے کام کرتے ہیں۔ اتنی بات زائد ہے کہ حسین علی منزل پر اتر کر پاپڑ اور مٹھائی کے کھلونے خرید لاتا ہے۔ دونوں بھائی مل کر کھا لیتے ہیں۔ آج میں تمہارے والد کی نصیحت پر عمل کیا۔ چار بجے پانچ کے عمل میں ہاپوڑ سے چل دیا۔ سورج نکلے بابوگڈھ کی سرائے میں آ پہنچا۔ چارپائی بچھائی۔ اس پر بچھونا بچھا کر حقا پی رہا ہوں اور یہ خط لکھ رہا ہوں۔ دونوں گھوڑے کول آ گئے۔ دونوں لڑکے رتھ میں سوار آتے ہیں۔ اب وہ آئے اور کھانا کھا لیا اور چلے۔ تم اپنی استانی کے پاس جا کر یہ رقعہ سراسر پڑھ کر سنا دینا۔ شمشاد کو کتاب کے مقابلے اور صحیح کی تاکید کر دینا۔

(۸)

رقعے کا جواب کیوں نہ بھیجا تم نے ؟
ثاقب حرکت یہ کی ہے بیجا تم نے
حاجی کلو کو دیکے بے وجہ جواب
غالب کا پکا دیا کلیجا تم نے

(۹)

اے روشنی دیدہ شہاب الدین خان
کتنا ہے بتاؤ کس طرح سے رمضان
ہوتی ہے تراویح سے فرصت کب تک
سنتے ہو تراویح میں کتنا قرآن ؟

میرزا امیرالدین احمد خاں فرخ مرزا

اے مرم چشم جہان بین غالب!

پہلے القاب کے معنے سمجھ لو، یعنی چشم جہاں بین غالب کی پتلی، چشم جہاں بیں تمہارا باپ علاؤالدین بہادر اور پتلی تم، آج میں نے تمہارا خط دیکھا۔ مجھ کو بہت پسند آیا۔ استاد کامل نہ ہونے کے باوصف تم نے یہ کمال حاصل کیا۔ آفرین صد آفرین، میں اپنے اور تمہارے پروردگار سے کہ وہ رب العلمین ہے۔ یہ دعا مانگتا ہوں کہ تم زیادہ نہیں تو تمہارے باپ کے

لے باقر علی خاں اور حسین علی خاں ۲ یعنی شمشاد علی بیگ رضواں کی تاکید کر دینا کہ ''قاطع برہان'' کا مقابلہ اور تصحیح کرتا رہے۔

برابر علم و فضل اور تمہارے پردادا حضرت فخر الدولہ نواب احمد بخش خاں بہادر جنت آرامگاہ کے برابر جاہ جلال عنایت کرے۔ میاں تمہارے دادا نواب امین الدین خاں بہادر ہیں۔ میں تمہارا دلدادہ ہوں۔ خبردار ہر جمعہ کو اپنی صورت مجھے دکھا جایا کرو۔

والدعا لے

میرزا قربان علی بیگ خاں سالک

(۱)

میری جان، کن اوہام میں گرفتار ہے، جہاں باپ کو پیٹ چکا، اب چچا کو بھی رو، خدا تجھ کو جیتا رکھے اور تیرے خیالات و احتمالات کو صورت وقوعی دے۔ یہاں خدا سے بھی توقع باقی نہیں، مخلوق کا کیا ذکر، کچھ بن نہیں آتی، اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں۔ یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کیا ہے۔ جو دکھ مجھے پہنچتا ہے۔ کہتا ہوں۔ لو غالب کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں۔ آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب قرضداروں کو جواب دے۔ سچ تو یوں ہے۔ غالب کیا مرا، بڑا ملحد مرا۔ بڑا کافر مرا، ہم نے از راہ تعظیم، جیسا بادشاہ ہوں کہ بعد انکے جنت آرام گاہ، وعرش نشین خطاب دیتے ہیں، چونکہ یہ اپنے کو شاہ قلم وسخن جانتا تھا، سقر مقر اور ہاویہ زاویہ خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ آیئے نجم الدولہ بہادر ایک قرضدار کا گریبان میں ہاتھ ایک قرضدار بھوک سنا رہا ہے۔ میں ان سے پوچھ رہا ہوں جی حضرت نواب صاحب! نواب صاحب کیسے، اوغلان صاحب ہیں۔ آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں۔ یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے۔ کچھ تو کسو، کچھ تو بولو، بولے کیا ہے بے حیا، بے غیرت، کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام قرض لیے جاتا تھا۔ یہ بھی سوچا ہوتا، کہاں سے دونگا۔

(۲)

ولہ حسن الطاف خفیہ[۵] خیر و عافیت تمہاری معلوم ہوئی دم غنیمت ہے۔ جان ہے تو جہان ہے۔ کہتے ہیں کہ خدا سے نا امیدی کفر ہے۔ میں تو اپنے باپ میں خدا سے نا امید ہو کر کافر مطلق ہو گیا ہوں۔ موافق عقیدہ اہل اسلام جب کافر ہو گیا تو مغفرت کی بھی توقع نہ رہی۔ چل بھئی نہ دنیا، نہ دین[۶] مگر تم حتی الوسع مسلمان بنے رہو، خدا سے نا امید نہ ہو، ان مع العسر یسرا کو اپنا نصب العین

---

[۱] یہ خط اس زمانے میں لکھا گیا، جب دہلی میں میرزا غالب کے خطوط چھپ رہے تھے۔ نواب امین الدین احمد خاں مرحوم نے خود ایک مرتبہ راقم الحروف سے بیان کیا کہ خطوں کے چھپنے کا شہرہ سنا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ خاندان کے سب لوگوں کے نام خط ہیں تو میں نے بھی مرزا صاحب سے عرض کیا دادا جان، ہمارے نام بھی ایک خط لکھ دو۔ اس موقع پر میرزا نے فرمایا، کہ واہ تمہارے امین الدین احمد خاں ہیں۔ میں تو تمہارا دلدادہ، ہوں۔ یہ فقرہ خط میں نے بھی لکھ دیا۔ غالباً ۱۸۶۸ء کو واقعہ ہے۔ اس سلسلے میں ملاحظہ ہو خط نمبر ۵۶ بنام علاؤ الدین علائی۔ [۲] یعنی دوزخ اس کی جائے قرار ہو۔ ہاویہ اس کا زاویہ بنے۔ [۳] میرزا غالب کو شاہی دربار سے نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ خطاب ملا تھا۔ نجم الدولہ ان کے خطاب کا ایک جزو تھا۔ [۴] ترکی زبان میں خطاب کے لیے احترام کا لفظ، جیسے ہمارے ہاں جناب ہے۔ [۵] خدا پوشیدہ مہربانیاں کرتا ہے۔ اس اسلوب تحریر کو یقیناً کرامت سمجھنا چاہیے۔ [۶] قرآن کی آیت کا ٹکڑا جس کے معنی ہیں۔ تنگی کے ساتھ کشائش بھی ہے۔

رکھو:

در طریقت ہر چہ پیش سالک آید خیر اوست

گھر میں تمہارے سب طرح خیر و عافیت ہے۔ محمد میرزا پنجشنبہ اور جمعہ کو داستان کے وقت آجاتا ہے۔ رضوان ہر روز شب کو آیا ہے۔ یوسف علی خاں عزیز سلام اور باقر اور حسین علی بندگی کہتے ہیں۔ کلو داروغہ کورنش عرض کرتا ہے اوروں کو یہ پایہ حاصل نہیں کہ وہ کورنش بھی بجالائیں۔ خط بھیجتے رہا کرو۔ والدعا۔

صبح دوشنبہ ۶ صفر سال حال ۱۲۸۱ھ

اپنی مرگ کا طالب، غالب

۱۱، جولائی ۱۸۶۴ء

مرزا شمشاد علی بیگ خاں رضواں

فرزندلبند شمشاد علی بیگ خاں کو، اگر خفا نہ ہوں ،تو دعا، اگر آزدہ ہوں تو بندگی ۔غازی آباد سے جا کر طبع اقدس ناساز ہوگئی ۔ازآمدن کعبہ پشیمان شدہ باشی۔

قربان علی بیگ خاں کو دعا کہنا اور ان کا حال کہنا۔

آج شنبہ ۴ نومبر کی ہے۔ پرسوں نواب صاحب دورے کو گئے۔فرما گئے ہیں کہ دو ہفتے میں آؤں گا۔آ کر چار روز یہاں رہیں گے۔پھر نمائش گاہ بریلی کی سیر کو جائیں گے۔وہاں سے پھر کر جب آئیں جائیں گے تو صاحب کمشنر بریلی کا انتظار فرمائیں گے۔وہ پنجم دسمبر تک آجائیں گے۔تین دن تک جشن رہے گا۔اس کے دو چار روز بعد غالب رخصت ہوگا۔خدا کرے تم تک زندہ پہنچ جائے۔

پیر جی بہت یاد آتے ہیں۔ان کو دعا کہنا اور یہ کاغذ پہلے تم پڑھنا۔پھر سالک کو پڑھنا۔پھر میاں خواجہ امان اور حکیم رضا خاں وک دکھانا۔پھر مرزا تفضّل حسین خان کے پاس لیجانا۔اس قصیدے کے ساتھ کی نثر نواب ضیاءالدین خاں یا مرزا اتا قب سے مانگ لینا اور اسکی نقل کر لینا اور قاطع بابان کا حال لکھنا۔میں نے تیس روپے کی ہنڈوی۔سو روپے کی باقی حکیم جی کو بھیج دی ہے۔حضرت نے رسید بھی نہیں لکھی۔ ان سے رسید لکھوا بھیجو اور سب جلدوں کے شیرازے بندھ جائیں اور موٹا کاغذ دونوں طرف لگ جائے۔خبردار کوئی نسخہ بے جلد نہ رہے۔تین سو مجلد کے تیار ہونے کی خبر دار کوئی نسخہ بے جلد نہ رہے۔تین سو مجلد کے تیار ہونے کی خبر بقیہ حساب میرے پاس بھیج دینا۔یا روپیہ فورا بھیج دوں گا یا آکر دوں گا۔

گورنر کا حال لکھو۔ کون کون حاضر ہوا کس کس کی ملاقات ہوئی، فرخ سیر کے دادا صاحب آئے یا نہیں؟ اگر آئے ہیں تو رویداد مفصل لکھو۔ ہاں بھائی صاحب، ٹونک والے سید سراج احمد کا بھی حال ضرور لکھنا۔ علی نقی خاں وزیر شاہ اودھ کی حقیقت بھی ضرور لکھنا اور مجھ کو ان مقاصد کے جواب کا منتظر سمجھنا۔ آج دو شنبہ ۴ نومبر کی ہے۔ آٹھ دن میں خط کی آمد و شد یقینی ہے۔

ب۔ امین الدین احمد خاں والی لوہارو

نو دن راہ دیکھوں گا، دسویں دن اگر تمہارے خط نہ آیا تو میں رافضی بن جاؤں گا۔ امطالب مندرجہ کے جواب کا طالب

۴ نومبر ۱۸۶۵ء

غالب

IqbalCyberLibrary all rights reserved ©2002-2006

(۲)

مرزا، رسم تحریر خطوط بسبب ضعف ترک ہوتی جاتی ہے۔ تحریے کا تارک نہیں ہوں بلکہ متروک ہوں۔[۱] اب مجھے ویسا نہ سمجھو، جیسا چھوڑ گئے۔ رام پور کے سفر میں تاب و طاقت، حسن فکر لطف طبیعت، یہ سب اسباب لٹ گیا۔ اگر تمہارے خط کا جواب نہ لکھوں تو محل ترحم ہے۔ نہ مقام شکایت، سنو، میرے خط نہ پہنچنے سے تم کو تشویش کیوں ہو؟ جب تک زندہ ہوں۔ غمزدہ و افسردہ۔ ناتواں و نیم جان ہوں۔ جب مر جاؤں تو میرے مرنے کی خبر سن لوگے۔ پس جب تک میرے مرنے کی خبر نہ سنو۔ جانو کے غالب جیتا ہے۔ خستہ و ہژندہ بخو رود ر دمند۔ یہ سطریں لکھ کر اس وقت تمہارے بھائی[۲] کے پاس بھیجتا ہوں مگر انکو ہمیشہ سفر در وطن ہے۔ بفرض محال اگر گھر میں ہیں عنایت[۳] اللہ ان کو ورنہ محمد مرزا کو دے آئے گا۔ ربیع الثانی جمعہ کا دن صبح کا وقت ہے۔

ربیع الثانی (۱۲۸۳ھ یعنی اگست ۱۸۶۶ء)

میرزا باقر علی خاں کامل

اقبال نشان باقر علی خاں کو غالب نیم جان کی دعا پہنچے۔ بہت دن ہوئے کہ تمہارا خط آیا۔ مگر تم نے اپنے مکان کا پتا تو لکھا ہی نہ تھا۔ فقط الور کا نام لکھ کر چھوڑ دیا۔ میں کیونکر خط بھیجتا؟ بارے اب شہاب الدین خاں کی زبانی پتا معلوم ہوا۔ سو اب میں تم کو خط لکھتا ہوں۔ جنیا بیگم اچھی طرح ہے۔ میرے پاس آتی رہتی ہے اور تمہارے گھر میں سب طرح خیر و عافیت ہے۔ اکتوبر کے مہینے کی تمہاری تنخواہ تمہارے گھر بھیج دی۔ مرزا حسین علی خاں بندگی عرض کرتا ہے۔

تحرے ۱۶۔ نومبر ۱۸۶۷ء

اسد اللہ

(۲)

اقبال نشان مرزا باقر علی خاں کو غالب نیم جاں کی دعا پہنچے ۔تمہارا خط آیا ۔ تمہارے روزگار کی درستی آگے سن چکا تھا اب تمہارے لکھنے سے دیکھ بھی لی ۔ دل میرا خوش ہوا اور تم خاطر جمع رکھو۔جیسا کہ مہاراج ۶ نے تم سے کہا ہے ۔تمہاری ترقی ان شاءاللہ جلد ہوگی۔ مجھ سے جو تم گلہ کرتے ہو خط کے نہ بھیجنے کا۔ بھائی، اب میری انگلیاں نکمی ہوگئی ہیں اور بصارت میں بھی ضعف آگیا ہے ۔دو

---

۱ یعنی تم وک چھوڑ دونگا ، بے تعلق ہو جاؤں گا۔۲ میں نے تحریر نہیں چھوڑ دی ۔تحریر نے مجھے چھوڑ دیا یعنی تحریر کا دماغ ہی نہ رہا۔۳ مرزا قربان علی بیگ سالک ۔۴ میرزا غالب کا ملازم ۵ باقر علی خاں کی بڑی صاحبزادی جن کا اصل نام محمد سلطان بیگم تھا۔ خاندان والے اسے جندو بیگم کہا کرتے تھے اور میرزا غالب پیار سے اسے میرزا جیون بیگ پکارتے تھے ۔۶ یعنی شیو دھیان سنگھ والی الور جن کے پاس میرزا باقر علی خاں نوکر تھے ۔

سطریں نہیں لکھ سکتا۔اطراف و جوانب کے خطوط آئے ہوئے دھرے رہتے ہیں ۔ جب کوئی دوست آجاتا ہے ۔میں اس سے جواب لکھ دیتا ہوں ۔ پرسوں کا تمہارا خط آیا ہوا دھرا تھا۔اس وقت مرزا یوسف علی خاں آگئے ہیں ۔میں نے ان سے یہ خط لکھوا دیا۔تمہاری دادی ۱ اچھی طرح ہے ۔۲ بھائی اچھی طرح ہے ۔ تمہارے گھر میں سب خیر و عافیت ہے ۔تمہاری لڑکی اچھی طرح ہے ۔کبھی روز کبھی دوسرے تیسرے میرے پاس آجاتی ہے ۔

(۳)

نورچشم و راحت جان میرزا باقر علی خاں کو فقیر غالب کو دعا پہنچے۔ تمہارا خط جو میرے خط کے جواب میں تھا وہ مجھ کو پہنچا اس میں کوئی بات جواب طلب نہ تھی۔ اس خط میں ایک نئے امر کی اطلاع دیتا ہوں۔ وہ امر یہ ہے کہ میں نے اگلے مہینے میں۔ سبد چین کی ایک جلد مع عرضی۔ اقبال نشان میر تفضّل حسین خاں کی معرفت الور کو بھجوائی تھی۔ سواب کے ہفتے میں حضور پور مہاراجہ راؤ بہادر کا خط انھیں کی معرفت مجھ کو آیا۔ حضور نے ازراہ بندہ پروری القاب بہت بڑا مجھے لکھا اور خط میں فقرے بہت عنایت اور التفات کے بھرے ہوئے درج کیے۔ تم تو وہیں ہو۔ تم کو اس کی اطلاع ہو گئی تھی یا نہیں؟ اور اگر ہو گئی تھی تو تم نے مجھے کیوں نہیں لکھا؟ اب تم سے یہ پوچھتا ہوں کہ کبھی دربار میں کچھ میرا بھی ذکر آیا ہے یا نہیں؟ اور اگر آتا ہے تو کس طرح آتا ہے؟ حضور سن کر کیا فرماتے ہیں:

۷۔ دسمبر ۱۸۶۸ء

غالب

منشی گوپال تفتہ

ہرگوپال نام۔ تفتہ تخلص، سکندرآباد ضلع بلندشہر کا باشندہ۔ والد کا نام موتی لال۔ قوم کالستھ ۱۲۱۴ء میں محلّہ قانوگویاں میں پیدا ہوا۔ یعنی غالب سے دو برس چھوٹا تھا۔ ادبی خطوط غالب کے مولف نے لکھا ہے کہ ابتداء میں کچھ دن قانون گوئی کے عہدے پر مامور رہا۔ واقف بٹالوی کا دیوان پڑھ کر شاعری کا ذوق پیدا ہوا۔ ابتداء میں رامی تخلص تھا۔ غالب کی شاگردی اختیار کی تو تفتہ تخلص تجویز ہوا۔ غالب کے بعض خطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جانی بانکے لال رند وکیل راجہ بھرت پور کے ماتحت تفتہ کے لیے مالی منفعت کا کوئی انتظام تھا۔ جس کی نوعیت میری معلومات کے مطابق یہ ہے کہ بندوبست کے محکمے میں ملازمت مل گئی تھی۔ چنانچہ خط نمبر ۱۱ میں راجہ بھرت پور کے انتقال کی خبر سن کر تفتہ کو جو خط لکھا، اس میں فرماتے ہیں:

"مجھ کو فکر جانی جی کی ہے کہ اس علاقے میں تم بھی شامل ہو...... تم اگرچہ بابو صاحب (رند) کی محبت کا علاقہ رکھتے ہو۔ لیکن انھوں نے ازراہ دوراندیشی تم کو متوسل اس سرکار کا کر رکھا تھا اور تم مستغنیانہ اور لاابالیانہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ زنہار اب وہ روش نہ رکھنا۔ اب تم کو بھی لازم آ پڑا ہے جانی جی کے ساتھ روشناس احکام والا مقام ہونا۔"

ا۔ بیگم غالب ہے میرزا حسین علی خاں

یہ سلسلہ بظاہر جانی بانکے لال رند کی وفات تک قائم رہا ہوگا۔ جو غالباً ۱۸۵۵ء میں ہوئی۔ اس کے بعد تفتہ نے ساری زندگی آزادانہ گزار دی۔

بعض خطوں سے متبادر ہوتا ہے کہ تفتہ خاصے خوشحال تھے۔ ان کا روپیہ بنک میں جمع تھا (ملاحظہ ہو خط نمبر ۲۲) وہ اپنے خرچ سے اپنی کتابیں چھپواتے رہے (خط نمبر ۲۷) غدر کے بعد غالب پر عسرت کا شدید دور طاری تھا۔ اس زمانے میں تفتہ نے میرٹھ سے سو روپے بھیجے تھے۔ غالب خود لکھتے ہیں کہ "از میرٹھ تفتہ سفتہ زر بہ من فرستاد، (کلیات نثر غالب صفحہ ۴۰۸) غالباً اسی ہدیے کا ذکر خط نمبر ۳۰ میں بھی کیا ہے۔ لیکن آخری دور میں بہ ظاہر تفتہ کی مالی حالت کمزور ہوگئی تھی۔ چنانچہ اس نے نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ اور نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر کے قصیدے لکھے اور غالب نے ان قصیدوں کا صلہ دلانے کی سعی کی (خط نمبر ۹۲) خط نمبر ۱۱ سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے تفتہ کے لیے ریٹ گن صاحب کے ماتحت پندرہ بیس روپے مشاہرے کی ملازمت کے لیے سعی کے متعلق استفسار کیا۔

غالب سے تلمذ کا سلسلہ کب شروع ہوا۔ اس بارے میں یقینی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔ فارسی خطوں میں تفتہ کے نام ایک خط ہے جو فروری ۱۸۴۸ء میں لکھا گیا۔ یعنی اس سے پیشتر تفتہ شاگرد بن چکے تھے اور یہ رابطہ غالب کے آخری دم تک قائم رہا۔

تفتہ کا ایک لڑکا تھا۔ چتمبر سنگھ۔ جو ۱۸۵۵ء میں داغ جدائی دے گیا۔ اس صدمے نے کمر توڑ دی۔ ۱۸۷۹ء میں وفات پائی۔ صرف ایک لڑکی یادگار چھوڑی۔ کہا جاتا ہے کہ ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹنا گر تفتہ کے نواسے تھے۔ لیکن مالک رام صاحب نے چھان بین کی تو یہ بات غلط ثابت ہوئی۔

فارسی شعر خاصا کہتے تھے۔ اردو میں ان کے صرف دو شعر میں نے دیکھے ہیں۔

یعنی غالب کی تاریخ وفات کا قطعہ:

غالب وہ شخص تھا ہمہ داں جس کے فیض سے
ہم سے ہزار ہیچ مداں نامور ہوئے
فیض و کمال و صدق وصفا اور حسن و عشق
چھ لفظ اس کے مرتے ہی بے پاوسر ہوئے

"خمخانہ جاوید" میں مرقوم ہے کہ چار دیوان ان سے یادگار ہیں نواب علی حسن خاں، اپنے تذکرہ شعرفارسی میں فرماتے ہیں۔

"پنج دیوان شعرواردوابیات ہر یکے ازاں قریب سیزدہ ہزار بیت" (صبح گلشن صفحہ ۸۶)

میری نظر سے ان کا صرف ایک دیوان گزرا ہے۔ جو ۱۸۵ء میں مطبع کوہ نور (لاہور میں چھپا تھا۔ یہ قریباً چھ سو صفحے کا ہے اوراسمیں صرف غزلیات کے اشعار پونے آٹھ ہزار کے قریب ہیں۔ اکثر زمینوں میں دو دوغزلیں کہی ہیں۔

رباعیات ومتفرقات کے علاوہ اس دیوان میں ایک دومرثیے بھی ہیں۔ ایک تفتہ کے بیٹے لالہ تیمر سنگھ کا جس کے چودہ بنداور ۳۲۲ شعر ہیں۔ دوسرا جانی بانکے لال رندوکیل راجہ بھرت پور کا اس کے بارہ بنداور ۲۷۳ شعر ہیں۔ اسی طرح غالب کا مرثیہ بھی بہت لمبا لکھا تھا۔

"تضمین گلستان اور سنبلستان بھی ان کی تصانیف میں سے ہیں۔

اردو میں غالب کے سب سے زیادہ خطوط ان ہی کے نام ہیں، یعنی ۱۲۳۔ اس سے ظاہر ہے کہ تفتہ سے میرزا کا کتنا گہرا تعلق تھا اور میرا خیال ہے کہ سارے خطوط

محفوظ رہے۔۱۸۴۸ء۱۸۵۰ء اور ۱۸۵۱ء کا صرف ایک ایک خط ہے اور یہ امر قرین قیاس نہیں کہ گہرا تعلق پیدا ہونے کے باوجود سال بھر میں صرف ایک خط لکھا گیا ہو۔بقیہ سنین کی کیفیت یہ ہے۔

۱۸۵۲ء________پانچ یا چھ

۱۸۵۳ء________گیارہ یا بارہ

۱۸۵۴________چار یا پانچ

۱۸۵۶ء________ایک

۱۸۵۷ء________ایک

۱۸۵۸ء________چونتیس

۱۸۵۹ء________چودہ

۱۸۶۰ء________نو

۱۸۶۱ء________پانچ یا چھ

۱۸۶۲ء________چار یا پانچ

۱۸۶۳ء________نو

۱۸۶۴ء________چار

۱۸۶۵ء________آٹھ

آخری تین سوا تین برس کے کل چار خط ہے ۱۸۵۸ء میں دستنبو کی طباعت کے سلسلے میں زیادہ خط لکھے گئے۔لیکن یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ بار بار وقفے کیوں ہوئے۔مثلاً ۱۸۵۵ء کا کوئی خط موجود نہیں لیکن ۱۸۵۶ء کا صرف ایک خط

ہے جو ایوان کی تقریظ کے متعلق ہے۔ اور جسے میں قیاساً ۱۸۵۶ء کا قرار دیتا ہوں۔ اس لیے کہ تفتہ کا دوسرا دیوان ۱۸۵۷ء میں چھپا۔ ۱۸۵۷ء کا صرف ایک خط ہے اور اس میں کوئی ایسا اشارہ نہیں جس سے ظاہر ہو کہ مدت تک سلسلہ مکاتبت بند رہا۔ میرا خیال یہی ہے کہ سارے خط محفوظ نہ رہے۔ بلکہ بہت سے ضائع ہو گئے۔

تفتہ کو غالب از راہ محبت میرزا تفتہ کہتے تھے۔ غالباً انھیں کی وجہ سے جانی بانکے لال رند اور منشی بال مکند بے صبر نے غالب کی شاگردی اختیار کی۔

سخن شعرا میں بے صبر کے متعلق مرقوم ہے کہ وہ کانجی مل کے بیٹے سکندر آباد ضلع بلند شہر، کے باشندے اور تفتہ کے شاگرد تھے۔ زیادہ تر فارسی شعر کہتے تھے۔ میرزا کے بیان سے واضح رہے کہ بے صبر ان سے اصلاح لیتے تھے۔ مالک رام صاحب ایم۔اے نے لکھا ہے کہ سرکار انگریزی کے محکمہ مال میں منشی گری اور داروغائی کے عہدہ پر متمکن ہو گئے تھے۔ اسی سلسلے میں دہلی پہنچے اور غالب سے ملاقات کی تقریب پیدا ہوئی۔ ۱۸۹۰ء میں انتقال ہوا۔ ستر برس کی عمر پائی۔

(۱)

مہاراج!

آپ کا مہربانی نامہ پہنچا۔ دل میرا اگرچہ خوش نہ ہوا۔ لیکن ناخوش بھی نہ رہا۔ بہرحال مجھ کو کہ نالائق و ذلیل تریں خلائق ہوں۔ اپنا دعا گو سمجھتے رہو۔ کیا کروں۔ اپنا شیوہ ترک نہیں کیا جاتا۔ وہ روش ہندوستانی فارسی لکھنے والوں کی مجھ کو نہیں آتی کہ بالکل بھاٹوں کی طرح بکنا شروع کریں۔ میرے قصیدے دیکھو۔ تشبیب کے شعر بہت پاؤ گے اور مدح کے شعر کمتر۔ نثر میں بھی یہی حال ہے۔ نواب مصطفیٰ خاں کے تذکرے کی تقریظ کو ملاحظہ کرو ان کی مدح کتنی ہے۔ مرزا رحیم الدین بہادر حیا تخلص کے دیوان کے دیباچہ کو دیکھو۔ وہ جو تقریظ دیوان حافظ کی، موجب فرمایش جان جاکوب بہادر کے لکھی ہے اس کو دیکھو کہ فقط ایک بیت میں ان کا نام اور ان کی مدح آئی ہے اور باقی ساری نثر میں کچھ اور ہی اور مطالب ہیں۔ واللہ باللہ اگر کسی شہزادے یا امیر زادے کے دیوان کا دیباچہ لکھتا تو اس کی اتنی مدح نہ کرتا جتنی تمہاری مدح کی ہے۔ ہم کو اور ہماری روش کو اگر پہچانتے تو اتنی مدح کو بہت جانتے۔ قصہ مختصر تمہاری خاطر کی اور ایک فقرہ تمہارے نام کا بدل کر اس کے عوض ایک فقرہ اور لکھ دیا ہے اس سے زیادہ جتنی میری روش نہیں۔ ظاہر تم خود فکر نہیں کرتے۔ اور حضرات کے بہکانے میں آجاتے ہیں۔ وہ صاحب تو پیشتر اس نظم و نثر کو مہمل کہیں گے۔ کس واسطے کہ ان کے کان اس آواز سے آشنا نہیں جو لوگ قتیل کو اچھے لکھنے والوں میں جانیں گے

وہ نظم و نثر کی خوبی کو کیا پہنچا نیں گے؟

ہمارے شفیق عنشی نبی بخش صاحب کو کیا عارضہ ہے کہ جس کو تم لکھتے ہو، ماء الجبیں سے بھی نہ گیا، ایک نسخہ طب محمد حسین خانی میں لکھا ہے اور وہ بہت بے ضرر او رسودمند ہے۔ مگر اثر اس کا دیر میں ظاہر ہوتا ہے۔ وہ نسخہ یہ ہے کہ پان سات سیر پانی لیویں اور اس میں سیر پیچھے تولہ بھر چوب چینی کوٹ کر ملا دیں اور اس کو جوش کریں اور اس قدر کہ چہارم پانی جل جائے۔ پھر اس باقی پانی کو چھان کر کوری ٹھلیا بھر رکھیں اور جب باسی ہو جائے اس کو پئیں۔ جو غذا کھایا کرتے ہیں، کھایا کریں۔ پانی دن رات، جب پیاس لگے یہی پئیں۔ روز جوش کروا کر چھنوا کر رکھ چھوڑیں۔ برس دن میں اسکا فائدہ معلوم ہوگا۔ میرا سلام کہہ کر یہ نسخہ عرض

۱؎ اس سے مراد، ''گلشن بے خار'' ہے اس پر میرزا نے جو تقریظ لکھی تھی وہ کلیات نثر فارسی مطبوعہ نولکشو میں صفحہ ۶۹ پر ہے ۲؎ میرزا محمد حسن قتیل

کر دینا۔ آگے ان کو اختیار ہے۔ ۱؎

مئی ۱۸۴۸ء

بھائی، یہ مصرع جو تج کو بہم پہنچا ہے۔ فن تاریخ گوئی میں اس کو کرامت اور اعجاز کہتے ہیں۔ یہ مصرع سلمان ۲؎ ساوجی و ظہیر ۳؎ کا سا ہے۔ چار لفظ اور چاروں واقعہ کے مناسب۔ یہ مصرع کہہ کر اور مصرع کی فکر کرنی کس واسطے؟ راہ واہ! سبحان اللہ۔

اور یہ جو تم کو ''فر'' کے لفظ میں تردد ہوا اور ایک سوکھا ہوا شعر ظہوری کا لکھا بڑا تعجب ہے۔ یہ لفظ میرے ہاں پنج آہنگ میں دس ۴؎ ہزار جگہ آیا ہوگا۔ فر او رفرہ لفظ فارسی ہے۔ مرادف ''جاہ'' کو اور اس کو کس نے کہا ہے کہ بغیر ترکیب دیے نہ لکھے۔

عالی جاہ اور سکندر جاہ اور مظفر فر اور فریدوں فریوں بھی درست ہے اور صرف جاہ اور فریوں بھی درست ہے۔

اور ایک بات تم کو معلوم رہے کہ اس پورے خطاب بہادری کہنا بے جا ہے سنو، خطاب کے مراتب میں پہلے تو خانی کا خطاب ہے اور یہ بہت ضعیف ہے اور بہت کم ہے۔ مثلاً ایک شخص کا نام ہے میر محمد علی یا شیخ محمد علی بیگ اور اس کو خاندانی بھی خانی نہیں حاصل۔ پس جب اس کو بادشاہ محمد علی خاں کہہ دے، تو گویا اس کو خانی کا خطاب ملا اور جو شخص کہ اس کا نام اصلی محمد علی خاں ہے یا تو وہ قوم افغان ہے یا خانی اس کو خاندانی ہے۔ بادشاہ نے اس کو محمد علی خاں بہادر کہا۔ پس یہ خطاب ''بہادری'' کا ہے۔ اس کو بہادری کا خطاب کہتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر خطاب ''دوگی'' کا ہے یعنی مثلاً ''محمد علی خاں بہادر'' اس کو ''منیر الدولہ محمد علی خاں ج بہادر'' کہا۔ اب یہ خطاب دوگی'' کا ہوا۔ اس کو ''بہادری کا خطاب'' نہیں کہتے۔

۱؎ یہ ان خطوں میں سے ہے۔ جن پر شروع میں کوئی تاریخ درج نہ تھی۔ منشی مہیش پرشاد نے اسے اگست ۱۸۴۹ء کا قرار دیا لیکن جب منشی نبی بخش حقیر کے نام مکاتیب کا مجموعہ بنا ''نادرات غالب'' چھپا تو واضح ہوا کہ اس خط کو اگست ۱۸۴۹ء کا سمجھنا چاہیے ۲؎ عباسی خلافت کی تباہی کے بعد متفرق حکومتیں قائم ہو گئی تھیں۔ ان میں ایک حکومت خاندان جلائر کی تھی جس طرح کا مرکز بغداد تھا۔ اسی خاندان حکومت کا مداح مسلمان تھا جو ''سادہ'' (مغربی (ایران) کا رہنے والا تھا۔ اس لیے ساوجی مشہور رہوا۔ عام روایت کے مطابق ۷۶۹ھ میں فوت ہوا۔ قصیدہ گو اساتذہ میں شمار ہوتا ہے۔

سے ظہیر فاراب کا رہنے والا: مشہور قصیدہ گو شاعر تھا جس کے دیوان کے متعلق کسی نے کہا تھا:

دیوان ظہیر فاریابی
در مکہ بہ دزد اگر بیابی

اسی کا شعر ہے:

نہ کرسی فلک نہد اندیشہ زیر پا
تا بوسہ بر رکاب قزل ارسلاں دہد

سے فربہ معنی دبدو شوکت۔ دس ہزار سے مراد ہے "بہ کثرت"

اب اس خطاب پر افزائش جنگ کی ہوتی ہے۔ منیر الدولہ علی خاں بہادر شوکت جنگ۔ ابھی خطاب پورا نہیں۔ پورا جب ہوگا کہ جب "ملک" بھی پس پورے خطاب کو "خطاب بہادری" لکھنا یا غلط ہے۔ یہ واسطے تمہارے معلوم رہنے کے لکھا گیا ہے۔

اب آپ اس سات بیت کے قطعے کو اپنے دیوان میں داخل اور شامل کر لیجیے یعنی قطعوں میں لکھ دیجیے۔ جب تمہارا دیوان چھاپا جائے گا۔ یہ قطعہ بھی چھپ جائے گا، مگر ہاں منشی صاحب کے سامنے اس کو پڑھیے اور ان سے استدعا کیجیے کہ اس کو آگرہ بھیجیے تا کہ اس کو چھاپا جائے۔ اسعد الاخبار میں اور زبدۃ الاخبار میں یقین ہے کہ وہ تمہارے کہنے سے عمل میں لائیں گے۔ مجھ کو نیاضرور ہے کہ میں یہاں سے لکھوں؟ میں نے یہاں "صادق الاخبار" میں چھپوا دیا ہے۔

اگست ۱۸۵۰

(۳)

میں تم کو خط بھیج چکا ہوں۔ پہنچا ہوگا۔ کل ایک رقعہ میرے پاس آیا کوئی صاحب عطاء اللہ خان ہیں اور نامی تخلص کرتے ہیں۔ خدا جانے کہاں ہیں اور کون ہیں۔ ایک دوست نے وہ رقعہ میرے پاس بھیجا۔ میں نے اس کا جواب لکھ کر اسی دوست کے پاس بھیج دیا۔ رقعہ تم کو بھیجتا ہوں۔ پڑھ کر حال معلوم کرو گے۔

تمہارے شعر میں جو تردد تھا۔ اس کا جواب میں نے یہ لکھتا ہے۔ تم کو بھی معلوم رہے

رفت آنچہ بہ منصور شنیدی تو دمن ہم
اے دل سخنے ہست نگہدار زباں را

تردد یہ کہ "آنچہ بہ منصور رفت" نہیں دیکھا۔ آنچہ بر منصور رفت درست ہے۔ جواب دیا موحدہ علی کے معنی بھی دیتی ہے۔ پس جو کچھ بر سے مراد تھی۔ وہ باء موحدہ سے حاصل ہوگئی اور اگر باء موحدہ کے معنی معیت کے لیں، تو بھی درست ہے۔ نظیری کہتا ہے۔

شادی ککہ غبن میکشی و دم نمے زنی
در شہرایں معاملہ باہر گدا رود

اگر کوئی یہ کہے کہ (نظیری کے شعر میں) معاملہ ہے اور اس شعر (تفتہ کے شعر) میں معاملہ کا لفظ نہیں۔ جواب اس کا یہ ہے کہ سراسر دونوں شعروں کی صورت ایک ہے۔ نظیری کے ہاں "معاملہ" مذکور ہے اور تفتہ کے مقدر ہے۔ رفت کا صلہ اور

تعدیہ بامو حدہ کے ساتھ دونوں جگہ ہے۔ والسلام

اسد اللہ ۱۸۵۱ء

۱۔ غالب نے خطابات کی تدریجی ترتیب یہ بتائی ہے۔(۱) خان (۲) بہادر (۳) دولہ (۴) جنگ (۵) ملک۔ ممکن ہے مغلوں کے زمانے میں یہی ترتیب ہو۔ حیدر آباد کے آخری زمانے کے مروجات سے معلوم ہوتا ہے کہ خانی کا خطاب اڑ گیا تھا اور ترتیب یہ تھی (۱) جنگ (۲) دولہ (۳) ملک (۴) امراء (۵) جاہ (۶) فتح جنگ۔ نظام الدولہ۔ آصف جاہ۔ سکندر جنگ، اقبال الدولہ اقتدار الملک، وقار الدولہ ایک خطاب سلطنت کا بھی اختیار کیا گیا تھا۔ مثلاً یمین السلطنۃ۔"

(۴)

کیوں مہاراج۔ کول ؁ میں آنا اور منشی نبی بخش صاحب کے ساتھ غزل خوانی کرنی اور ہم کو یاد نہ لانا۔ مجھ سے پوچھو کہ میں نے کیونکر جانا کہ تم مجھ کو بھول گئے، کولی میں آئے اور مجھ کو اپنے آنے کی اطلاع نہ دی نہ لکھا میں کیونکر آیا ہوں اور کب تک رہوں گا کب جاؤں گا اور بابو صاحب ؁ سے کہاں جا ملوں گا، خیر، اب میں جو نے بے حیائی کرکے تم کو خط لکھا۔ لازم ہے کہ میرا قصور معاف کرو اور مجھ کو ساری اپنی حقیقت لکھو، تمہارے ہاتھ کی لکھی ہوئی غزلیں بابو صاحب کی میرے پاس موجود ہیں اور اصلاح پا چکی ہیں۔ اب میں حیران ہوں کہ کہاں بھیجوں۔ ہر چند انھوں نے لکھا ہے کہ اکبرآباد ہاشم علی خاں کو بھیج دو۔ لیکن میں نہ بھیجوں گا۔ جب وہ اجمیر یا بھرت پور پہنچ کر مجھ کو خط لکھیں گے۔ تو میں ان کو وہ اوراق ارسال کردوں گا یا تم جو لکھو گے۔ اس پر عمل کروں گا۔ بھائی ایک دن شراب نہ پیو یا کم پیو اور ہم کو دو چار سطریں لکھ بھیجو کہ ہمارا دھیان تم میں لگا ہوا ہے۔

رقم زدہ یک شنبہ ۴۔ جنوری ۱۸۵۲ء

اسداللہ

(۵)

شفیق بالتحقیق منشی ہرگوپال تفتہ ہمیشہ سلامت رہیں۔

آپ وہ خط جو آپ نے کانپور سے بھیجا تھا۔ پہنچا۔ بابو صاحب صاحب کے سیر و سفر کا حال اور آپ کا لکھنو جانا اور وہاں کے شعراء سے ملنا سب معلوم ہوا۔ اشعار جناب رند کے پہنچے کے ایک ہفتہ بعد درست ہو گئے اور اصلاح اور اشارے اور فوائد جیسا کہ میرا شیوہ ہے عمل میں آیا۔ جبتک کہ ان کا یا تمہارا خط نہ آوے اور اقامت گاہ معلوم نہ ہو۔ میں کواغذ ضروری کہاں بھیجوں اور کیوں کر بھیجوں ج، اب جو تمہارے لکھنے سے جانا کہ ۱۹ فروری تک اکبر آباد آؤ گے تو میں نے یہ خط تمہارے نام لکھ کر لفافہ کر رکھا ہے۔ آج انیسویں ہے پرسوں اکیسویں کو لفافہ آ گرہ کو روانہ ہوگا۔ بابو صاحب کو میں نے خط اس واسطے نہیں لکھا کہ جو کچھ لکھنا چاہیے تھا وہ خاتمہ اوراق اشعار پر لکھ دیا ہے۔ تم کو چاہیے کہ ان کی خدمت میں میرا اسلام پہنچا ؤ اور سفر کے انجام اور حصول مرام کی مبارک باد اور اوراق اشعار گزرانو اور یہ عرض کرو کہ جو عبارت خاتمے پر مرقوم ہے۔ اس کو غور سے پڑھیے اور اپنا

بود ہندو دل سوے اسلام

دوسری جگہ لکھتے ہیں

مدر او ہمیں پسر مے داشت

در جہاں و نشاں کہ بود نہ ماند

دستور العمل گردانیے۔ نہ یہ کہ سرسری دیکھیے اور بھول جائیے۔ بس تمام ہوا وہ

پیام کہ جو بابو صاحب کی خدمت میں۔

اب پھر تم سے کہتا ہوں کہ وہ جو تم سے اس شخص کو لی [1] کا حال لکھا تھا۔ معلوم ہوا۔ ہر چند اعتراض ان کا لغو اور پرسِتش ان کی بے مزہ ہو۔ مگر ہمارا منصب نہیں کہ معترض کو جواب نہ دیں یا سائل سے بات نہ کریں۔ تمہارے شعر پر اعتراض، اس راہ سے کہ وہ ہمارا دیکھا ہوا ہے۔ گویا ہم پر ہے۔ اس سے ہمیں کام نہیں کہ وہ مانیں یا نہ مانیں۔ کلام ہمارا اپنے نفس میں معقول و استوار ہے جو زبان دا ہو گا۔ سمجھ لے گا۔ غلط فہم اور کج اندیش لوگ نہ سمجھیں، نہ سمجھیں۔ ہم کو تمام خلق کی تہذیب و تلقین سے کیا علاقہ؟ تعلیم و تلقین واسطے دوستوں کے اور یاروں کے ہے۔ نہ واسطے اغیار کے تمہیں یاد ہو گا کہ میں تمہیں بار بار سمجھایا ہے کہ خود غلطی پر نہ رہو اور غیر کی غلطی سے کام نہ رکھو۔ آج تمہارا کلام وہ نہیں کہ کوئی اس پر گرفت کر سکے۔ مگر ہاں:

حسود راچہ کنم کو ز خود برنج در است

والسلام والا کرا

رقم زدہ ۱۹ فروری و مرسلہ بست و

یکم فروری ۱۸۵۲ء غالب

---

[1] علی گڑھ کا پرانا نام [2] بابو سے مراد جانی بانکے لال رند ہیں۔ جیسا کہ خط نمبر ۵ سے واضح ہو جاتا ہے۔ وہ راجہ بھرت پور کے وکیل تھے اور غالبا جے پور سے بھی کچھ تعلق تھا۔ میرزا غالب کے شاگرد تھے۔ مزید حالات معلوم نہ ہو سکے۔ تفتہ ان کے پاس ملازم ہو گئے تھے۔ تفتہ کے دوسرے دیوان مطبوعہ مطبع "کوہ نور" لاہور میں جانی بانکی لال رند پر ایک طویل مرثیہ موجود ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انکا انتقال

۱۲۷۲ء میں ہوا ہے۔ مرثیہ میں تفتہ کے فضائل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

حالانکہ ان کے ایک بھائی بیج ناتھ کا ذکر خود میرزا غالب نے خط نمبر ۱۳ بنام تفتہ میں کیا ہے

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

(۶)

بندہ پرور بیش از بیش وکم از کم یہ ترکیب فصیح ہے۔اس کو کون منع کرتا ہے اور جلال اسیر کی یہ بیت بہت پاکیزہ اور خوب ہے۔اس کے معنی یہی ہیں کہ در زمان من مہر بیش از بیش شد و زمان تو وفا کم از کم شد۔ استاد کیا کہے گا لڑے کا لف و نشر ہے من او تو مہر او ر وفا بیش از بیش اور کم از کم یاد رہے کہ بیشتر از بیش و کمتر از کمتر اگر چہ بحسب معنی جائز ہے لیکن فصاحت اس میں کم ہے۔بیش از بیش اور کم از کم افصح ہے وہ شعر تمہارا خوب ہے اور ہمارا دیکھا ہوا ہے۔

تحسیں از تو نہ ایم کم ، ولے صبر
بیش است ترا، کم است

لیکن ہاں پہلے مصرع میں اگر کمتر ہوتا تو اور اچھا تھا۔بہر حال اتنا خیال رہے کہ ایسی جگہ تر کا لفظ فصیح ہے چنانچہ میر اشعر ہے۔

جلوہ کن ، منت منہ ، از ذرہ کمتر نیستم
حسن با ایں تابناکی آفتا بے بیش نیست

مصرع

ورنہ چشم تو چراز روزن دیوار کم است

یہاں بہت ہی اوپری معلوم ہوتا ہے اور نرا ہندی کا ترجمہ رہ جاتا ہے، فارسیت نہیں رہتی۔مصرع:

سہل مشمار زندگانی ہا

مجھ کو یاد پڑتا ہے کہ میں نے اس مطلع کو یوں درست کر دیا ہے۔

۱باشندہ کول ۲میرزا جلال اسیر بن مومن شہرستان اصفہان کا باشندہ اور شاہ عباس صفوی کے رشتہ داروں میں تھا۔ شعر کو "خیال" کہا جاتا تھا ان میں شامل ہے۔ ۱۶۳۹ء میں فوت ہوا۔

رایگان ست زندگانی

می تواں کرد جانفشانی

اور اس صورت میں یہ مطلع ایسا ہو گیا تھا کہ میرے دل میں آئی تھی تم کو نہ دوں اور خود اس زمین میں غزل لکھوں۔ پھر میں نے خست نہ کی اور تم کو دے دیا۔ حضرت نے ملاحظہ نہیں فرمایا۔ یہ خط جو آپ نے مجھے لکھا ہے۔ شراب کے نشہ میں لکھا ہے اور وہ اصلاحی اوراق بھی اسی عالم میں ملاحظہ فرمائے ہیں۔ اب مصرع:

گلہ تا کے زندگانی ہا

اس کو موقوف کیجئے اور وہ مطلع رہنے دیجئے کہ وہ بہت خوب ہے۔ بعینہ مولانا ظہوری ۱کا معلوم ہوتا ہے۔ بھائی ہمارے اوراق اصلاحی کو غور سے دیکھا کرو۔ ہماری محنت تو ضائع نہ جائے۔

ایامے چند، جمع الجمع ایسی کھلی ہوئی نہیں ہے۔ بلکہ فقیر کے نزدیک جمع الجمع ہی نہیں ہے۔ مثلاً۔ معانی چند اور احکام چند اور اسرار چند یہ آدمی لکھ سکتا ہے مگر ہاں۔ آماں ہا۔ یہ کھلی سورٹھ ہے۔ مصرع:

خطا ے بزرگاں گرفتن خطاست

ہم کو اپنی تہذیب سے کام ہے۔ اغلاط میں سند کیوں ڈھونڈتے پھریں؟ مثلاً

حضرت حافظ نے لکھا ہے:

صلاح کار کجا و من خراب کن

بہ بین تراوت رہ از کجاست تا بکجا

میری جان، ایسے موقع پر یہ چاہیے کہ بزرگوں کے کلام کو ہم مورد اعتراض نہ کریں اور خود اس کی پیروی نہ کریں۔ فقیر گوارا نہیں رکھنے کا جمع الجمع کو اور برا نہ کہے گا حضرت صائب کو[2]۔

شہرت فلانے شخص کے انتقال کو بہ غلط، البتہ میرا بھی موجب ملال ہے، مگر یہ کونسا واقعہ عظیم ہولناک ہے کہ صاحبان اخبار اس کو چھاپیں؟ آپ اس طرف اتنا، اعتنا نہ فرمایئے[3]

گر ماہ آفتاب بمیرد، عزا مگیر

ورتیروز ہرہ ہے کشتہ شد، نوحہ خواں مخواہ

میں کالے[5] صاحب کے مکان سے اٹھ آیا ہوں۔ بلی ماروں کے محلے میں ایک حویلی کرایہ کو لے کر اس میں رہتا ہوں۔ وہاں کا میرا رہنا تخفیف کرایہ کے واسطے نہ تھا۔ صرف کالے صاحب کی محبت سے رہتا تھا۔ واسطے اطلاع کے تم کو لکھا ہے۔ اگرچہ میرے خط پر حاجت مکان کے نشان کی نہیں ہے۔ دور ہلی بہ اسد اللہ برسد کافی ہے۔ مگر اب

---

[1] فارسی کے مشہور شعراء میں سے ہے۔ اکبر کے عہد میں ہندوستان آیا تھا۔ پھر دکن پہنچ کر بیجاپور میں عادل شاہی دربار میں ملازم ہو گیا۔ ملک قمی نے اپنی لڑکی سے شادی کر دی تھی۔ نظم کے علاوہ اس کی نثر بھی مشہور ہے۔ نثر مدت تک فارسی نصاب

میں رہی ۔۲؎ مطلب یہ ہے کہ صاحب نے اگر کہیں جمع الجمع سے کام لیا ہے تو اسے برا کہنے کی ضرورت نہیں ۔لیکن میں خود جمع الجمع کو جائز نہیں سمجھتا ۔اس لیے کہ اغلاط میں اساتذہ کی سندیں ڈھونڈ ھنا بالکل غیر مناسب ہے ۔۳؎ مطلب یہ ہے کہ تفتہ نے لکھا کہ فلاں شخص کے انتقال کی شہرت ہو گئی او واقعہ غلط تھا اس کی تر دید میں چھپوا دیجے ۔۴؎ دوستارے ۵؎ شیخ نصیر الدین عرف کالے میاں، بہادر کے پیر اور مولانا فخر الدین فخر عالمن کے پوتے تھے ۔انکا مکان گلی قاسم جان میں تھا ۔جس میں غالب کئی برس رہے

لال کنواں نہ لکھا کرو ۔محلّہ بلی ماراں لکھا کرو ۔

اورہاں صاحب ہمارے شفیق بابو صاحب کا حال لکھو ۔مسہل سے فراغت ہوئی اوراب اجمیر اور وہاں سے آبو پہاڑ کو کب جائیں گے ۔میرا سلام بھی کہہ دیجیے گا والسالم

محررہ دوشنبہ بست ودوم مارچ ۱۸۵۲ء

اسداللہ

(۷)

کاشانۂ دل کے ماہ دو ہفتہ منشی ہرگوپال تفتہ، تحریر میں کیا کیا سحر طرازیاں کرتے ہیں۔ اب ضرور آپڑا ہے کہ ہم بھی جواب اسی انداز سے لکھیں، سنو صاحب، یہ تم جانتے ہو کہ زین العابدین خاں مرحوم میرا فرزند تھا اور اس کے دونوں بچے کہ وہ میرے پوتے ہیں۔ میرے پاس آرہے ہیں۔ اور دمبدم مجھ کو ستاتے ہیں اور میں تحمل کرتا ہوں۔ خدا گواہ ہے کہ میں تم کو اپنے فرزند کی جگہ سمجھتا ہوں۔ پس تمہارے نتائج طبع میرے معنوی پوتے ہوئے۔ جب ان عالم صورت کے پوتوں سے کہ مجھے کھانا نہیں کھانے دیتے۔ ننگے ننگے پاؤں میرے پلنگ پر رکھتے ہیں۔ کہیں پانی لڑھاتے ہیں۔ کہیں خاک اڑاتے ہیں، میں نہیں تنگ آتا تو ان معنوی پوتوں سے کہ ان میں یہ باتیں نہیں۔ میں کیوں گھبراؤں گا آپ ان کو جلد بہ سبیل ڈاک میرے پاس بھیج دیجیے کہ میں ان کو دیکھوں۔ وعدہ کرتا ہوں کہ پھر جلد انکو تمہارے پاس بہ سبیل ڈاک بھیج دوں گا۔ حق تعالیٰ تمہارے عالم صورت کے بچوں کو جیتا رکھے۔ اور ان کو دولت و اقبال دے اور تم کو ان کے سر پر سلامت رکھے اور تمہارے معنی بچوں یعنی نتائج طبع کو فروغ شہرت اور حسن قبول عطا فرمائے۔ بابو صاحب کے نام کا خط ان کے خط کے جواب میں پہنچتا ہے۔ ان کو دے دیجیے گا اور ہاں صاحب بابو صاحب اور تم آبو کو جانے لگو تو مجھ کو اطلاع کرنا اور تاریخ روانگی لکھ بھیجنا تا کہ میں بے خبر نہ رہوں۔ والدعا

نگاشتہ جمعہ ۱۸ء جون ۱۸۵۲ء   اسداللہ

(۸)

کل تمہارا خط آیا۔ رازِ نہانی مجھ پر آشکار ہوا۔ میں سمجھا ہوا تھا کہ تم دیوانگی اور شورش کر رہے ہو۔ اب معلوم ہوا کہ حق بجانب تمہارے ہے۔ میں جو اپنے عزیز کو نصیحت کرتا ہوں تو اپنے نفس کو مخاطب کر کے کہتا ہوں کہ اے دل تو اپنے کو اس عزیز کی جگہ سمجھ کر تصور کر کہ اگر تجھ پر یہ حادثہ پڑا ہوتا تو اس بلا میں گرفتار ہوا ہوتا تو کیا کرتا؟ عیاذاً باللہ! اب میں تم کو کیوں کر کہوں کہ بے حرمتی گوارا کرو اور رفاقت نہ چھوڑو۔ بلکہ یہ بھی زاید ہے۔ جو دوست سے کہے کہ تو ہمارے واسطے اس کو ترک کر۔ بہ ہر حال دوست کی دوستی سے کام ہے۔ اس کے افعال سے کیا غرض جو محبت واخلاص ان میں تم میں ہے۔ بدستو بلکہ روز افزوں رہے۔ ساتھ رہنا اور پاس رہنا نہیں ہے۔ نہ سہی۔

وصلے کہ دراں ملال باشد
ہجراں بہ ازاں وصال باشد

آمدم برسر مدعا۔ تمہاری رائے ہم کو اس باب میں پسند۔ عجیب طرح کا پیچ پڑا کہ نکل نہیں سکتا۔ نہ تم کو کچھ سمجھا سکتا ہوں اور نہ ان کو کچھ کہہ سکتا ہوں۔ مجھے تو اس موقع میں سوائے اس کے کہ تماشائی نیرنگ قضاوقدر بنا رہوں، کچھ بن نہیں آتی ہے۔

بہ چشم کہ تار کردگار جہاں
دریں آشکار چہ دارد نہاں

جے پور کا امر محض اتفاقی ہے۔ بے قصد و بے فکر درپیش آیا ہے۔ ہوسنا کا نہ

ادھر متوجہ ہوا ہوں۔ بوڑھا ہو گیا ہوں۔ بہرا ہو گیا ہوں سرکار انگریزی میں بڑا پایہ رکھتا تھا۔ رئیس زادوں میں گنا جاتا تھا۔ پورا خلعت پاتا تھا۔ اب بدنام ہو گیا ہوں اور ایک بہت بڑ دھبا لگ گیا ہے۔ کسی ریاست میں دخل کر نہیں سکتا۔ مگر ہاں استاد یا پیر یا مداح، بن کر راہ رسم پیدا کروں۔ کچھ فائدہ اٹھاؤں کچھ اپنے کسی عزیز کو وہاں داخل کر دوں۔ دیکھو کیا صورت پیدا ہوتی ہے۔

تا نہال دوستی کے بر دہد
حلیا رقیم و تخمے کا شتیم

صحاف کے ہاں سے دیوان ابھی نہیں آیا۔ آجکل آ جائے گا۔ پھر اس کے جزو اور ان کی تیاری کر کے روزانہ کروں گا۔[2] ابھی کول میں آرام کرو۔ اپنے بچوں میں دل بہلاؤ۔ اگر جی چاہے تو اکبر آباد چلے جائیو۔ وہاں اپنا دل بہلائیو۔ دیکھو اس خودداری میں ادھر سے کیا ہوتا ہے۔ اور وہ کیا کرتے ہیں۔

والسلام

جمعہ دہم دسمبر ۱۸۵۲ء[3]

اسد اللہ

---

[1] زین العابدین خاں عارف غالب کے ہم زلف نواب غلام حسین مسرور کا فرزند اور بیگم غالب کے حقیقی بھانجا تھا۔ مسرور نے اپنی بیوی بنیادی بیگم بنت الٰہی بخش خاں معروف کو چھوڑ کر دوسری شادی کر لی تھی۔ اور عارف قریبی رشتے کی بان پر تیز خوش فکری کے باعث غالب سے وابستہ ہو گیا تھا۔ ۳۵ برس کی عمر پائی۔ جمادی الاخری ۱۲۶۱ء اپریل ۱۸۵۲ء میں انتقال کیا۔ اس کے شاگرد الگزاندر بدر لے،

متخلص بہ آزاد نے جو الک صاحب ''مشہور تھا۔ مندرجہ ذیل مصرع سے تاریخ وفات نکالی تھی، جس میں سے ایک کا تخرجہ تھا۔۔۔۔۔۔ عارف پسند رحمت حق ہو چکا ہے آج۔۔۔۲ باقر علی خاں اور حسین علی خاں

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

(۹)

پرسوں تمہارا خط آیا۔ حال جو معلوم تھا۔ وہ پھر معلوم ہوا۔ غزلیں دیکھ رہا تھا۔ آج شام کو دیکھنا تمام ہوا تھا۔ غزلوں کو

۱؎ اس عبارت سے متبادر ہوتا ہے کہ کسی معاملے میں تفتہ اور رند کا یکجا رہنا اور تفتہ کا ملازمت جاری رکھنا مشکل ہو گیا تھا اور ہو ترک ملازمت کا خواہاں تھا۔ غالب نے روکا، لیکن جب حقیقت حال کا علم ہوا تو اعتراف کیا کہ تفتہ کی رائے درست ہے۔

۲؎ مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جے پور کے راجہ کے پاس اپنا دیوان بھیجنا تھا۔ جس کی جلد بندھوائی۔ پھر جزدان یعنی غلاف بنوانا تھا۔ بدنام ہو گیا ہوں اور دھبا لگ گیا ہے۔ اشارہ غالباً اسیری کی طرف ہے جو قمار بازی کے سلسلے میں عمل میں آئی تھی۔

۳؎ تمام نسخوں میں ۱۸۵۳ء ہے جو بداہتہً غلط ہے۔ ۱۸۵۳ء کے خط یا اس زمانے کے دوسرے خطوں میں جے پور ہنڈی آنے کا ذکر ہے۔ یقیناً اس سلسلے میں تحریک پہلے ہوئی تھی۔ لہذا یہ خط ۱۸۵۲ء کا ہونا چاہیے

رکھ دیا تھا چاہتا تھا کہ ان کو بند کر کے رہنے دوں۔ کل صبح ۹ بجے ڈاک میں بھیج دوں۔ خط کچھ ضرور نہیں ہیں۔ اسی خیال میں تھا کہ ڈاک کا ہرکارہ آیا۔ جانی جی کا خط لایا۔ اس کو پڑھا۔ اب مجھ کو ضرور ہوا کہ خلاصہ اس کا تم کو لکھوں۔ یہ رقعہ لکھا۔ خلاصہ بطریق ایجاز یہ ہے کہ عرضی گزری دیوان گزرا راول جے کے نام کا خط گزرا۔ راجہ صاحب دیوان کے دیکھنے سے خوش ہوئے۔ جانی جی نے جو ایک معتمد اپنا سعد اللہ خاں وکیل کے ساتھ کر دیا ہے۔ وہ منتظر جواب کا ہے۔ راول جی نے

ایجنٹ کے استقبال کو گئے ہیں۔ اور اب اجنٹ علاقہ، جے پور کی راہ سے نہیں آتا۔ آگرہ۔ اور گوالیار کرولی ہوتا ہوا اجمیر آئے گا اور اس راہ میں جے پور کا عمل نہیں۔ بس چاہیے کہ راول جی الٹے پھر آویں۔ انکے آئے پر عرضی کا جواب ملے گا اور اس میں دیوان کی رسید بھی ہوگی۔ بھائی تم کو بہت ڈھونڈ ھتے اور تمہارے بغیر بہت بے چین ہیں میں نہ تم کو کچھ کہہ سکتا ہوں، نہ انکو سمجھا سکتا ہوں۔ تم وہ کرو کہ جس میں سانپ مرے اور لاٹھی نہ ٹوٹے۔ ہاں یہ بھی جی نے لکھا تھا کہ بہت دن کے بعد غشی جی کا خط آیا ہے۔

اسد اللہ

All rights reserved.
©2002-2006

(۱۰)

بھائی!

پرسوں شام ڈاک کا ہرکارہ آیا اور ایک خط تمہارا اور ایک جانی جی لایا۔ تمہارے خط میں اوراق اشعار اور بابو صاحب کے خط میں جے پور کے اخبار۔ دو دن سے مجھ کو وجع الصدر لاحق ہے اور میں بہت بے چین ہوں۔ ابھی اشعار کو دیکھ نہیں سکتا۔ بابو صاحب کے بھیجے ہوئے کاغذ تم کو بھیجتا ہوں۔ اشعار بعد و چار روز کے تم کو بھیجے جائیں گے۔

مرسلہ جمعہ ۲۵۔ فروری ۱۸۵۳ء

اسد اللہ

(۱۱)

بھائی،

آج مجھ کو بڑی تشویش ہے اور یہ خط میں تم کو کمال سراسیمگی میں لکھتا ہوں۔ جس دن میرا خط پہنچے۔ اگر وقت ڈاک کا ہو، تو اسی وقت جواب لکھ کر روانہ کرو اور اگر وقت نہ رہا تو چار و ناچار دوسرے دن جواب بھیجو۔ منشا تشویش و اضطراب کا یہ ہے کہ کئی دن سے راج بھرت پور کی بیماری کی خبر سنی جاتی تھی۔ کل سے اور بری خبر شہر میں مشہور ہے۔ تم بھرت پور سے قریب ہو۔ یقین ہے کہ تم کو تحقیقی حال معلوم ہوگا۔ جلد لکھو کیا صورت ہے؟ راجا کا مجھ کو غم نہیں، مجھ کو فکر جانی جی کی ہے کہ اسی علاقہ میں تم بھی شامل ہو۔ صاحبان انگریز نے ریاستوں کے باب میں ایک قانون واضح کیا ہے، یعنی جو رئیس مر جاتا ہے۔ سرکار اس ریاست پر قابض و متصرف ہو کر رئیس زادہ کے بالغ ہونے تک بندوبست ریاست کا اپنے طور پر رکھتی ہے۔ سرکاری بندوبست میں کوئی قدیم الخدمت موقوف نہیں ہوتا۔ اس صورت میں یقین ہے کہ جانی صاحب کا علاقہ بدستور قائم رہے۔ مگر یہ وکیل ہیں۔ معلوم نہیں مختار کون ہے۔ اور ہمارے بابو صاحب اور اس مختار میں صحبت کیسی ہے۔ رانی سے ان کی کیا صورت ہے تم اگرچہ بابو صاحب کی محبت کا علاقہ رکھتے ہو۔ لیکن انھوں نے از راہ دوراندیشی کو متوسل اس سرکار کا کر رکھا اور تم مستغنیانہ اور لاابالیانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ زنہار اب وہ روش نہ رکھنا۔ اب تم کو یہ لازم آ پڑا ہے۔ جانی جی کے ساتھ روشناس حکام والا مقام ہونا۔ پس چاہیے کول کی آرامش کا ترک کرنا اور

خواہی نخواہی بابو صاحب کے ہمراہ رہنا۔ میری رائے میں یوں آیا ہے اور میں نہیں لکھ سکتا کہ موقع کیا ہے اور مصلحت کیا ہے؟ جانی جی بھرت پور آئے ہیں یا اجمیر میں ہیں؟ کس فکر میں ہیں اور کیا کر رہے ہیں؟ واسطے خدا کے، نہ مختصر نہ سرسری، بلکہ مفصل اور منقح جو کچھ واقع ہوا اور جو صورت ہوا مجھ کو لکھو اور جلد کہ مجھ پر خواب وخور حرام ہے۔ کل شام کو میں نے سنا، آج صبح قلعے[1] نہیں گیا اور یہ خط لکھ کر ازراہ احتیاط بیرنگ روانہ کیا ہے کہ تم بھی اس کا جواب بیرنگ روانہ کرنا آدھ آنہ ایسی بڑی چیز نہیں، ڈاک کے لوگ بیرنگ خط کو ضروری سمجھ کر پہنچاتے ہیں اور پوسٹ پیڈ پڑا رہتا ہے۔ جب اس محکمے میں جانا ہوتا ہے تو اس کو بھی لے جاتے ہیں زیادہ کیا لکھوں کہ پریشان ہوں۔ ضروری جواب طلب۔

نوشتہ چاشت گاہ دو شنبہ ۲۸ء مارچ ۱۸۵۳ء

---

[1] سینے کا درد [2] یعنی مشہور ہے کہ راجہ فوت ہوگیا۔

آج منگل کے دن ۵ اپریل کو تین گھڑی دن رہے ڈاک خانہ کا ہرکارہ آیا۔ ایک خط منشی صاحب کا اور ایک خط تمہارا اور ایک خط بابو صاحب کا لایا۔ بابو صاحب کے خط سے اور مطالب تو معلوم ہو گئے مگر ایک امر میں حیران ہوں کہ کیا کروں یعنی انھوں نے ایک خط کسی شخص کا آیا ہوا میرا پاس بھیجا ہے اور مجھ کو یہ لکھا ہے کہ اس کو الٹا میرے پاس بھیج دینا۔ حالانکہ خود لکھتے ہیں کہ میں اپریل کی چوتھی کو سپاٹو یا آبو جاؤں گا اور آج پانچویں ہے۔ بس تو وہ کل روانہ ہو گئے۔ اب میں وہ خط کس کے پاس بھیجوں؟ ناچار تم کو لکھتا ہوں کہ میں خط کو اپنے پاس رہنے دوں گا۔ جب وہ آ کر مجھ کو اپنے آنے کی اطلاع دینگے۔ تب وہ خط انکو بھیجوں گا۔ تم کو تردد نہ ہو کہ کیا خط ہے۔ خط نہیں مینڈھو لال کالستھ غماز کی عرضی تھی۔ بنام مہاراجہ بیکنٹھ باشی، سعایت بابو صاحب پر مشتمل کہ اس نے لکھا تھا کہ ہردیو سنگھ جانی جی کا دیوان اور ایک شاعر دہلی کا دیوان مہاراجہ جے پور کے پاس لایا اور جانی کی درستی روزگار جے پور کی سرکار میں کر رہا ہے۔ اس کے بھیجنے کی یہ وجہ کہ پہلے ان کے لکھنے سے مجھ کو معلوم ہوا تھا کہ کسی نے ایسا کہا ہے۔ میں نے ان کو لکھا تھا کہ تم کو میرے سر کی قسم اب ہردیو سنگھ کو بلوالو۔ میں امر جزوی کے واسطے امر کلی کا بگاڑ نہیں چاہتا۔ اس کے جواب میں انھوں نے وہ عرضی بھیجی۔ اور لکھ بھیجا کہ راجہ مرنے والا ایسا نہ تھا کہ ان باتوں پر نگاہ کرتا۔ اس نے یہ عرضی گزرتے ہی میرے پاس بھیج دی۔ فقط بارے خط آنے سے جانی جی کی طرف سے

۱؎ یعنی لال قلعہ یا دربار شاہی ۲؎ مطلب یہ کہ جانی جی اور غالب کا دیوان اپنے آدمی کے ہاتھ جے پور بھیجا۔ مینڈھو لال نے راجہ کے پاس شکایت کی کہ ہر دیو سنگھ جانی جی اور غالب کا دیوان پیش کر کے جانی جی کے لیے جے پور میں ملازمت کا بندوبست کرانا چاہتا ہے۔ غالب کو معلوم ہوا تو فوراً جانی جی کو لکھا کہ ہر دیو سنگھ کو واپس بلا لو۔ میری خاطر اپنے معاملات کیوں خراب کر۔ ''کلی امر'' جانی جی کی ملازمت اور عزت تھی۔ ''جزوی امر'' غالب کے لیے مالی امداد کی سعی۔ لیکن جانی جی نے لکھا کہ راجہ ایسا نہ تھا۔ اس لیے عرضی میرے پاس بھیج دی اور وہی تحریر اب آپ (غالب) کے پاس بھیج رہا ہوں۔

میری خاطر جمع ہوگئی۔ مگر اپنی فکر پڑی۔ یعنی بابو صاحب آبو ہوں گے۔ اگر ہر دیو سنگھ پھر کر آئے گا تو وہ بغیر ان کے ملے اور ان کے کہے مجھ تک کا ہے کو آئے گا۔ خیر وہ بھی لکھتا ہے کہ راول کہیں گیا ہوا ہے۔ اس کے آنے پر رخصت ہوگی۔ دیکھیے وہ کب آوے اور کیا فرض ہے کہ اس کیا آتے ہی رخصت ہو بھی جائے۔

تمہاری غزل پہنچی۔ یہ البتہ کچھ دیر سے پہنچے گی تمہارے پاس، گھبرانا نہیں۔

والدعا، جواب طلب

نگاشتہ سہ شنبہ روز ورود نامہ و مرسلہ چہار شنبہ اپریل ۱۸۵۳ء

اسد اللہ

(۱۳)

بھائی،

ہاں میں نے ''زبدۃ الاخبار'' میں دیکھا کہ رانی صاحبہ مر گئیں۔ کل ایک دوست کا خط اکبرآباد سے آیا۔ وہ لکھتا ہے کہ راجہ مرا، رانی انہیں مری ابھی ریاست کا کوئی رنگ قرار نہیں پایا۔ صورت انتظام جانی بیجناتھ کے آنے پر موقوف ہے۔ یہاں تک اس دوست کی تحریر ہے۔ ظاہر اس کو بابو صاحب کا نام نہیں معلوم۔ ان کے بھائی کا نام یاد رہ گیا۔ صرف اس دوست نے بطریق اخبار لکھا ہے۔ اس کو میری اور جانی جی کی دوستی کا بھی علم نہیں۔ حاصل اس تحریر سے یہ ہے کہ اگر یہ خبر سچ ہے تو ہمارے تمہارے دوست کا کام بنا رہے گا۔ آمین یارب العالمین۔

صاحب، جے پور کا مقدمہ اب لائق اس کے نہیں ہے کہ اس کا خیال کریں۔ ایک بنا ڈالی تھی۔ وہ نہ اٹھی۔ وہ نہ آتھی۔ راجا لڑکا ہے۔ اور چھچھورا ہے۔ راول جی اور سعداللہ خاں بنے رہتے تو کوئی بات نکل آتی۔ اور یہ جواب آپ لکھتے ہیں کہ راجا تیرے دیوان کو پڑھا کرتا ہے اور پیش نظر رکھتا ہے یہ بھی تو آپ ازروے تحریر منشی ہردیو سنگھ کہتے ہیں۔ انکا بیان کیوں کر دل نشین ہو؟ وہ بھی جو بابو صاحب لکھ چکے ہیں کہ پانسو روپے نقد اور خلعت مرزا صاحب کے واسطے تجویز ہو چکا ہے۔ ہولی ہو چکی اور میں لے کر چلا۔ پھاگن، چیت، بیساکھ، نہیں معلوم ہولی کس مہینے میں ہوتی ہے۔ آگے تو پھالن میں ہوتی تھی۔

بندہ پرور، بابو صاحب نے پہلی بار تو مجھ کو دو ہنڈیاں بھیجی ہیں۔ سو سو روپے کی

،ایک تو میر احمد حسین میکش کے واسطے۔ راجا صاحب کی طرف سے، تاریخ تولد کنور صاحب کے انوام میں اور ایک اپنی طرف سے مجھ کو بطریق نذر شاگردی، بعد اس کے دو ہنڈیاں سو سو روپے کی بد چار چار پانچ پانچ مہینے کے آئیں مع میر احمد حسین کے صلے کے روپیوں کے چار سو اور اس کے علاوہ تین سو، اور یہ کہ چار سو یا تین سو کتنے دن میں آئے۔ اس کا حساب کنور صاحب کی عمر پر حوالے ہے۔ اگر دو برس کے ہیں تو دو برس میں اور اگر تین برس کے ہیں تو تین برس میں۔

ہاں صاحب، یہ وہی میر قاسم علی صاحب ہیں جو میرے پرانے دوست ہیں۔

پرسوں یا ترسوں جو ڈاک کا ہرکارہ تمہارا خط لایا تھا۔ وہ ایک خط میر صاحب کے نام کا، کوئی میاں حکمت اللہ ہیں۔ ان کا میرے مکان کے پتے سے لایا تھا۔ وہ میں نے لے کر رکھ لیا ہے۔ جب میر صاحب آ جاویں تو ان کو میرا سلام کہنا اور کہنا کہ حضرت، اگر میرے واسطے نہیں، تو اس خط کے واسطے آپ دلی آئیے

غالب

بھائی،

تم نے مجھے کون سا دو چار سو روپے کا نوکر یا پنسن دار قرار دیا ہے جو دس بیس روپے مہینا قسط کی آرزو رکھتے ہو، تمہاری باتوں پر کبھی ہنسی آتی ہے۔ اگر احیانا تم کبھی دہلی کے ڈپٹی کلکٹر یا وکیل کمپنی ہوے تو مجھ کو بڑی مشکل پڑتی۔ بہر حال خوش رہو اور متفکر نہ ہو۔ پانچ روپے مہینا پنسن انگریزی میں سے قسط مقرر ہو گیا ادائے زر۔ ابتدائے جون ۱۸۵۳ء یعنی ماہ آئندہ میں سے یہ قسط جاری ہو گی[۱]

بابو صاحب کا خط تمہارے نام کا پہنچا۔ عجب تماشا ہے۔ دو رنگ کے ہونے سے خجل ہوتے ہیں۔ میں ان کے عذر چاہنے سے مرا جاتا ہوں۔ ہائے اتفاق، آج میں نے ان کو لکھا اور کل راجہ کے مرنے کی خبر سنی۔ واللہ باللہ اگر وہ رن پہلے سن لیتا تو اگر میری جان پر آبنتی تو ابھی ان کو نہ لکھتا۔ جے پور کے آئے ہوئے روپے کی ہنڈوی اس وقت تک نہیں آئی۔ شاید آج شام تک یا کل تک آجائے۔ خدا کرے وہ آبو پہاڑ سے ہنڈوی روانہ کر دیں۔ ورنہ پھر خدا جانے، کہاں کہاں جائیں گے اور روپیہ بھیجنے میں کتنی دیر ہو جائے گی۔ خدا کرے زر مصارف ہر دیو سنگھ اسی میں سے مجرا لیں۔ میری کمال خوشی ہے اور یہ نہ ہو تو پچیس رپے ہر دیو سنگھ کو میری طرف سے ضرور دیں۔

منشی صاحب[۲] کا ایک خط ہاترس سے آیا تھا۔ کل اس کا جواب ہاترس روانہ کر چکا ہوں۔ والدعا

محررہ دوشنبہ ۲ مئی ۱۸۵۳ء

اسد اللہ

عجب تماشا ہے۔ بابو صاحب لکھتے ہیں کہ ہردیو سنگھ آ گیا اور پانسو کی ہنڈوی لایا مگر اس کے مصارف کی بابت انتیس روپے کئی آنے اس ہنڈوی میں محسوب ہو گئے۔ سو میں اپنے پاس سے ملا کر پورے پانسو کی ہنڈوی تجھ کو بھیجتا ہوں۔ میں نے ان کو لکھا کہ مصارف ہردیو سنگھ کے میں مجرا دوں گا۔ تکلیف نہ کرو۔ پچیس، یہ میری طرف سے ہردیو سنگھ کو اور دے دو اور باقی کچھ کم ساڑھے چار سو کی ہنڈوی جلد روانہ کرو۔ سو بھائی آج تک ہنڈوی نہیں آئی۔ میں حیران ہوں۔ وہ حیرانی کی یہ کہ اس ہنڈوی کے بھروسے پر قرضداروں سے وعدہ جون کے اوائل کا کیا تھا۔ آج جون کی پانچویں ہے۔ وہ تقاضا کرتے ہیں اور میں آج کل کر رہا ہوں۔ شرم کے مارے بابو صاحب کو کچھ نہیں لکھ سکتا۔ جانتا ہوں وہ سیکڑا پورا کرنے کی فکر میں ہوں گے۔ پھر وہ کیوں اتنا تکلف کریں؟ تیس روپے کی کون سی ایسی بات ہے۔ اگر مصارف ہردیو سنگھ میرے ہاں سے مجرا ہوئے تو کیا غضب ہوا۔ انتیس اور پچیس چون روپیہ نکال ڈالیں اور باقی ارسال کریں۔ لفافے خطوط کے جو میں نے بھیجے تھے۔ وہ بھی ابھی نہیں آئے۔ بالجملہ یہ کیسی بات ہے کہ میں یہ بھی جانتا کہ بابو صاحب کہاں ہیں؟ پہاڑ پر ہیں یا بھرت پور آئے ہیں؟ اجمیر آنے کی ظاہرا کوئی

۱؎ یہ انکم ٹیکس کی رقم تھی جس کا بوجھ میرزا پر ایک دم آ پڑا تھا اور وہ رقم ماہانہ قسطوں میں پنسن سے کٹتی رہی۔ ۲؎ منشی صاحب سے مراد غالباً منشی نبی بخش حقیر ہیں۔

وجہ نہیں ہے۔ ناچار کثرت انتظار سے عاجز آ کر آج تم کو لکھا ہے۔ تم اس کا

جواب مجھ کو لکھو اور اپنی رائے لکھو کہ وجہ درنگ کی کیا ہے؟ زیادہ زیادہ

مرقومہ پنجم جون ۱۸۵۳ء روز یکشنبہ

جواب طلب　　　　　　　　اسد اللہ

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

تمہاری خیر و عافیت معلوم ہوئی۔ غزل نے محنت کم لی۔ بھائی إکا بارتس سے آنا معلوم ہوا۔ آویں تو میرا سلام کہہ دینا۔

یہ تمہارا دعا گو اگرچہ اور امور میں پایہ عالی نہیں رکھتا۔ مگر احتیاج اس کا پایہ بہت عالی ہے۔ یعنی بہت محتاج سو دوسو میں میری پیاس نہیں بجھتی۔ تمہاری ہمت پر سو ہزار آفریں۔ جے پور کو دو ہزار ہاتھ آ جاتے تو میرا قرض رفع ہو جاتا اور پھر اگر دو چار برس کی زندگی ہوتی۔ تو اتنا ہی قرض اور مل جاتا۔ یہ پانسو تو بھائی تمہاری جان کی قسم، متفرقات میں جا کر سو ڈیڑھ سو بچ رہے گے۔ سو وہ میرے صرف میں آویں گے۔ مہاجنوں کا سودی جو قرض ہے وہ بقدر پندرہ سولہ سے کے باقی رہے گی اور وہ جو سو بابو صاحب سے منگوائے گئے تھے۔ وہ صرف انگریز سوا گر کے دینے تھے قیمت اس چیز کی جو ہمارے مذہب میں حرام اور تمہارے مشرب میں حلال ہے۔ سو وہ دیے گئے۔ یقین ہے کہ آجکل میں بابو صاحب کا خط مع ہندوی آ جاوے۔ بابو صاحب کے جو خطوط ضروری اور کواغذ ضروری میرے پاس آئے ہوئے تھے۔ وہ میں نے پنجشنبہ ۲۶ مئی کو پارسل میں ان کے پاس روانہ کردیے اور اس میں بھی لکھ بھیجا کہ ہندوی اور میرے بھیجے ہوئے لفافے جلد بھیج دو۔ پنجشنبہ پنجشنبہ پندرہ دن آج پورے ہوئے

(۱۷)

بھائی،

جس دن تم کو خط بھیجا، تیسرے دن ہر دیو سنگھ کو عرضی اور پچیس روپے کی رسید اور پانسو کی ہنڈوی پہنچی۔ تم سمجھے۔ بابو صاحب نے پچیس روپے ہر دیو سنگھ کو دیے اور مجھ سے مجرانہ لیے۔ یہ ہر حال ہنڈوی بارہ دن کی معیاری تھی۔ چھ دن گزر گئے۔ چھ دن باقی تھے۔ مجھ کو صبر کہاں؟ متی کاٹ کر روپے لے لیے۔ قرض متفرق سب ادا ہوا۔ بہت سبکدوش ہو گیا۔ آج میرے پاس سینتالیس نقد بکس میں اور چار بوتل شراب اور تین شیشے گلاب کے توشہ خانے میں موجود ہیں۔ الحمد اللہ علی احسانہ۔

بھائی صاحب، آ گئے ہوں تو میر قاسم علی خاں[۱] کا خط ان کو دے دو اور میرا سلام کہو اور پھر مجھ کو لکھو تا کہ میں ان کو خط لکھوں۔ بابو صاحب بھرت پور آ جائیں تو آپ کاہلی نہ کیجیے گا۔ اور ان کے پاس جائیں گا کہ وہ تمہارے جویاے دیدار ہیں۔

سہ شنبہ ۲۴ جون ۱۸۵۳ء

اسد اللہ

---

[۱] منشی نبی بخش حقیر [۲] یعنی شراب

(۱۸)

بھائی،

میں نے مانا تمہاری شاعری کو، میں جانتا ہوں کہ کوئی دم تم کو فکرِ سخن فرصت نہ ہوگی۔ پر جو تم نے التزام کیا ہے ترصیع کی صنعت کا اور در لخت شعر لکھنے کا۔ اس میں ضرور نشست معنی بھی ملحوظ رکھا کرو اور جو لکھو، اس کو دوبارہ سہ بارہ دیکھا کرو۔

کیوں صاحب یہ ڈبل خط پوسٹ پیڈ بھیجنا اور وہ بھی دلی سے سکندر آباد کو آیا حاتم کے سوا اور میرے سوا کسی نے کیا ہوگا۔ ہنسی آتی ہے تمہاری باتوں پر خدا تم کو جیتا رکھے اور جو کچھ تم چاہو۔ تم کو دے۔ جانی جی کی بڑی فکر ہے میں تم کو لکھا چاہتا تھا کہ ان کا حال لکھو۔ تمہارے خط سے معلوم ہوا کہ تم کو بھی نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہیں۔ یقین ہے کہ اجمیر میں ہوں گے ۔۔۔ مگر خط نہیں بھیجا جاتا کہ وہاں مقیم نہیں ہیں۔ خدا جانے کب چل نکلیں۔ بہر حال تم بھرت پور کے قریب ہو اور ان کے متوسلوں کو جانتے ہو اگر ہو سکے تو کسی کو لکھ کر خبر منگوا لو اور جو کچھ تم کو معلوم ہو وہ بھی مجھ کو لکھو۔ منشی صاحب مع منشی عبداللطیف اکول میں آ گ ئے۔ کل انکا خط مجھ کو آیا تھا۔ آج اس کا جواب بھی روانہ کر دیا۔

یک شنبہ ۱۲ اگست ۱۸۵۳ء

اسد اللہ

صاحب،

دوسرا پارسل جس کو تم نے بے تکلف خط بنا کر بھیجا ہے۔ پہچانا اصلاح کی جگہ، نہ تحریر سطور کا پیچ وتاب سمجھ میں آتا ہے۔ تم نے الگ الگ دو ورقے کیوں نہ لکھا اور چھدرا چھدرا کیوں نہ لکھا؟ ایک آدھ ورقہ زیادہ زیادہ ہو جاتا تو ہو جاتا۔ بہ ہر حال اب مجھے چننے پڑتے ہیں سوالات۔ اگر کوئی سوال میری نظر نہ چڑھے اور رہ جائے تو سطور کی موڑتوڑ کا گناہ سمجھنا۔ میرا قصور نہ جاننا۔

''بلا رباے'' اس میں تامل کیا ہے؟ لفظ صحیح اور پورا تو یہی ہے ''ربا'' اس کا مخفف ہے۱۲ خار را در راہش افشانم کہ چوں خواہد شدن

۱۲

بہت خوب اور معقول، میں اس وقت نہ جانے کس خیال میں تھا۔ چوں خواہد شدن۔ وکنوں خواہد شدن دو لیف قافیہ سمجھا تھا۔

لفظ بے پیر تورانی بچہ ہائے ہندی نژاد کا تراشا ہوا ہے۔ جب اشعار اردو میں اپنے شاگردوں کو نہیں باندھنے دیتا تو تم فارسی شعر میں کیوں کر اجازت دوں گا۔

میرزا جلال اسیر علیہ الرحمتہ مختار ہیں اور ان کا کلام سند ہے۔ میری کیا مجال ہے کہ ان کے باندھے ہوئے لفظ کو

---

۱۲ ابن نبی بخش حقیر

غلط کہوں؟ لیکن تعجب ہے اور بہت تعجب ہے کہ امیر زادہ، ایران ایسا لفظ لکھے ۱۲

''شست بست دل، جب ظہوری کے ہاں تو باندھیے۔ یہ روزمرہ ہے اور ہم روزمرہ میں ان کے پیرو ہیں۔ بے پیر ایک لفظ ٹکسال باہر ہے ورنہ صاحب زبان ہونے میں اسیر بھی ظہوری سے کم نہیں۔۱۲

زاہدا ایں سخت ہرزہ کہ گفتی چہ شدی

حق غفور است گناہے شدہ ام تاچہ شود

پہلے زاہد سے یہ سوال غلط کہ چہ شدی تراچہ شد سوال ہو سکتا ہے۔ پھر گناہے شدہ ام، یہ جواب مہمل، گناہے کردہ ام، جواب ہو سکتا ہے۔ یہاں تم کہو گے۔ ہمہ تن گناہ یا سراپاگناہ یا سراسرگناہ شدہ ام، یہ جواب اس جواب سے سراسر بے ربط ہے۔ جب تک ہمہ تن گناہ نہ ہو، معنی نہیں بنتے۔ ہرگز ہرگز، اصلاح دیے ہوئے شعر میں مضمون تمہارا ہی رہا اور ٹکسال کے موافق ہوگیا۔ عجب ہے تم سے کو صرف شدہ ام اور تاچہ شود کے پیوند میں الجھ کر حقیقت معنی سے غافل رہے۔

باز آر دل خود از چنیں کار

آرزارچہ می کنی دلم را

اہلی نے زبردستی کی ہے مگر ہاں اس نے ایک وجہ ٹھہرالی ہے۔ یعنی آزدن مصدر اور آرزدہ مضارع او آزار، امر اء امر بمعنی اسم جامد آتا ہے اور اسم جامد کردن کے ہاتھ پیوند پاتا ہے۔ خیر رہنے دو۔

کند آں آہوے وحشی ز برم سردا رم

یہ شعر موید میرے کلام کا ہے۔ بروارم و زردارم، وسرادارم، فردارم، یہ سب

الفاظ ایک طرح کے ہیں۔ الف ممدہ کہیں نہیں۔ ہاں بودارو رو دارو، فرو دارو تمہارے عقیدے کی تائید کرتا ہے۔ مگر یہ شعر استاد کا نہیں مشائخ میں سے ایک بزرگ تھے مولانا علاؤالدین۔

ما مقیماں کوے دلداریم

یہ ترجیع بند انھیں کا ہے۔ ان کو فقر و فنا و سلوک میں (سند) سمجھنا چاہیے۔ نہ انداز کلام میں۔

"پر مور است شمشیر ے کہ بر موے میاں دادر"

بھائی، خدا کی قسم یہ مصرع تلوار کی نازکی سند نہیں ہوسکتا۔ یہ تو ایک مضمون ہے۔ کمر، مور، اور تلوار پر مور وجہ تشبیہ علاقہ پر مور با مور، مانند علاقہ مشیر با میان بنزاکت وجہ تشبیہ کبھی نہیں۔ انصاف شرط ہے۔ تلوار کی خوبی تیزی ہے یا نازکی۔ یہ دھوکہ نہ کھاؤ اور تلوار کی نازک نہ باندھو خو میں اور تلوار میں مناسبت نہیں پائی جاتی۔ جانے دو۔ شعر سے ہاتھ اٹھاؤ۔

میاں خمیدن بھی صحیح اور چمیدن بھی صحیح۔ اس میں کس کو تردد ہے۔ مگر لغت او رمحاورے اور اصطلاح میں قیاس پیش نہیں جاتا۔ ہندوستانی کے باتونی لوگوں کو خم و چم بولتے سنا ہے۔ آج تک کسی نظم ونثر فارسی میں یہ لفظ نہیں دیکھا۔ لفظ پیارا مجھ کو بھی پسند مگر کیا کروں جو اپنے پیشواؤں سے سنا ہو۔ اس کو کیوں کر صحیح جانوں؟ چمید صیغہ ماضی کا ہے۔ "چمیدن" ایک مصدر ہے صحیح اور مسلم۔ "چمد" مضارع "چم" امر۔ اس میں کیا گفتگو ہے؟ کلام خم و چم میں ہے۔

سوالات ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان کا جواب لکھ دیا۔ اب اشعار کو دیکھتا ہوں خدا

کرے مجھ سے کوئی باقی نہ رہ گیا ہو اور تم بھی جب ان اوراق طلسمی کو دیکھو تو کوئی اصلاح کا اشارہ تم سے باقی نہ رہ جائے۔ غرض یہ ہے کہ اب پھر اس طرح کبھی نہ لکھنا۔ میں بہت گھبراتا ہوں۔ خمیدست، ورسیدست میں زنی دست، یہ قافیہ درست ہے مگر است کا الف سب جگہ اڑا دو اور یاد رہے کہ سین تے کافی ہے الف ضرور نہیں۔

غالب

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

(۲۱)

وہ کیا خوبی قسمت ہے میری! بہت دن سے دھیان لگا ہوا تھا کہ اب منشی جی کا خط آتا ہے اور ان کی خیر و عافیت معلوم ہوتی ہے خط آیا اور خیر و عافیت معلوم نہ ہوئی یعنی معلوم ہوا کہ خیر نہیں ہے اور پانو میں چوٹ لگی ہے سنو صاحب یہ بھی غنیمت ہے کہ ہڈی کو صدمہ نہیں پہنچا ہے۔ اتنا پھیلاؤ بھی اس سبب سے ہوا کہ کوئی مالش کرنے والا نہ ملا اور چوٹ کہن ہو گئی۔ البتہ کچھ دیر میں افاقت ہو گی۔ بعد افاقت ہونے کے تم مجھ کو اطلاع کرنے میں دیر نہ کرنا۔ میرا دھیان لگا ہوا ہے۔

بابو صاحب کا خط آیا ہے پھر انھوں نے تکلیف کی اور وہ کچھ بھیجا جو آگے بھیجا تھا۔ تمھاری مفارقت سے بہت ملول ہیں۔ طرز تحریر سے فراوانی محبت معلوم ہوتی تھی۔ میں نے ان کو لکھ بھیجا ہے کہ منشی جی گئے نہیں، ضرورت کو کیا کریں؟ جلد پھر آئیں گے۔ آپ انکو اپنے پاس ہی تصور فرمایئے۔

بابو ہرگو بند سنگھ تعطیل میں کول گئے ہونگے جو آپ کے خط میں ان کی بندگی لکھی آئی۔ کیوں انھوں نے تکلیف کی؟ بہمہ جہت دو سو قدم پر میرے گھر سے ان کا مکان اور وہ جاتے وقت مجھ سے رخصت نہ ہو گئے۔ اب بندگی سلام کیا ضرور؟

ہاں صاحب۔ یہ تم نے اور بابا صاحب نے کیا سمجھا ہے کہ میرے خط کے سرنامے پر الی کے محلے کا پتا لکھتے ہو۔

میں بلی ماراں میں رہتا ہوں۔ الی کا محلّہ یہاں سے بے مبالغہ آدھ کوس ہے۔ وہ تو ڈاک کے ہرکارے مجھ کو جانتے ہیں۔ ورنہ خط ہر رہ پھرا کرے۔ آگے کالے

صاحب کے مکان میں رہتا تھا۔ اب بلی ماراں میں کرایے کی حویلی میں رہتا ہوں۔ املی کا محلہ کہاں اور میں کہاں؟

منشی جی کو لکھتے ہو کہ حاکم کیساتھ گئے اور پھر لکھتے ہو کہ نہ دورے میں بلکہ اپنے کام کو، بہ ہر صورت اب آ گئے ہوں گے۔ میرا سلام کہیے گا اور اپنی خیر و عافیت کے ساتھ ان کی معاودت کی خبر لکھیے گا ورنہ مجھ کو خط لکھنے میں تامل رہے گا۔

''نظر شگفتن'' و ''گوش شگفتن'' ہم نہیں جانتے۔ اگرچہ منشی ہرگوپال تفتہ اور مولانا نورالدین ظہوری نے ہو:

نظارہ ، راز خون دلم گل در آستین
خونش ملو، بگو کہ ز چشم چمن چکید

یہ نہ سمجھنا کہ چمن از چشم چکیدن، شگفتن گوش و نظر کی مانند غراہت رکھتا ہے۔ یہ خونفشانی چشم کا استعارہ ہے اور خونفشانی صفت چشم ہو سکتی ہے۔ اگر نظر کا خوش ہونا اور کان کا شاد ہونا جائز ہوتا تو ہم اس کا استعارہ بشگفتگی کر لیتے۔ خوش ہونا جب صفت چشم و گوش نہ ہو تو ہم کیا کریں؟

یاد رہے یہ نکات سوائے تمہارے اور کو میں نہیں بتاتا۔ میری بات غور کر کے سمجھ لیا کرو۔ میں پوچھنے سے اور تکرار سے ناخوش نہیں ہوتا۔ بلکہ خوش ہوتا ہوں۔ مگر ہاں ایسی تکرار جیسی بیش اور بیشتر کے باب میں کی تھی۔ ناگوار گزرتی ہے کہ وہ صریح تہمت تھی مجھ پر جو میں آپ لکھوں گا تم کو اس کے لکھنے سے کیوں منع کروں گا۔

اے صد ہزار راز نہاں اندریں سخن
گر کم سخن توئی نگہت کم سخن مباد

ہر چہ با نفس خو دکنم زبدی

نیکیش نام لے مے توانم کرد

یہ دونوں شعر بے سقم میں رہنے دو۔

سر ناکا میم سلامت باد

کام را کام مے تو ا نم کرد

میں نہیں سمجھتا کہ اس کے معنی کیا ہیں۔ کام کو کام سب کر سکتے ہیں۔ اس میں لطف کیا ہے؟

زر تر کتاری ، آں نازنین سوار ہنوز

ز سبزہ میدمد انگشتِ زینہار ہنو ز لے

لے اس مطلع میں واقعی ایک ہنوز زائد اور بے ہودہ ہے۔ تتبع کے واسطے سند نہیں ہوسکتا۔ یہ غلط

لے علی نام، حزیں تخلص بڑے اونچے خاندان میں سے تھا۔ اصفہان میں پیدا ہوا، جب افغان پر مسلط ہوئے اوصفوی سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا تو حزیں ایران سے نکلا جب نادر شاہ ایران پر مسلط ہو گیا تو سندھ کے راستے ہندوستان چلا آیا۔ ملتان، لاہور، دہلی، اور آگرہ ہوت ے ہوئے بنارس پہنچا او روہیں رخت اقامت ڈال دیا تھوڑی مدت کے لیے عظیم آباد پٹنہ گیا تھا۔ بنارس ہی میں فوت ہوا۔ آخری دور کا بلند مرتبہ فارسی شاعر مانا جاتا ہے ۲ے یہ حزیں کے دوالگ الگ مصرے یہ ہیں

ز ترک ت ازی آں نازنیں سوار ہنوز

محض ہے۔ یہ سقم ہے یہ عجیب ہے۔ اس کی کون پیروی کرے گا حزیں تو آدمی تھا یہ مطلع اگر جبریل کا ہوتو اس کو سند نہ جانو اور اس کی پیروی نہ کرو۔

بھائی تمہارا مصرع اس قبیل سے نہیں ہے۔ اس میں تو ملکنید متمم معنی ہے۔ ملکنید زائد نہیں ہے، مگر خرابی یہ ہے کہ فارسی رہنے دو تو اور اگر ہندی کرو تو مصرع مہمل اور بے معنی ہے:

چہ گل، چہ لالہ، چہ نسرین چہ نسترن ملکنید

کیا گلاب کا پھول کیا لالہ کیا موتیا کے چمپا نہ کرو۔ زنہار نہ کرو، یعنی کیا نہ کرو، اور جب تمہیں کہو کہ صاحب ذکر نہ کرو، تب کوئی جانے، ورنہ کبھی جانا نہیں جاتا کہ ذکر نہ کرو۔ تم نے کہا بھی کہ ہمارا مقصود یہ ہے کہ ذکر نہ کرو۔ حضرت ذکر مضاف کیونکر ہوسکتا ہے گل و لالہ و نسرین و نسترن کی طرف؟ کہو گے کہ ذکر کا لفظ نہیں بیان کا لفظ اوپر کے مصرع میں ہے۔ وہ بیان کا لفظ رسوں سے اور زنجیروں سے ان چار لفظوں سے ربط نہیں پاتا۔ مطلع لکھو، قطعہ لکھو، ترجیع بند لکھو، یہ مصرع معنی دینے ہی کا نہیں۔ مہمل محض ہے۔ والسلام

اسد اللہ

صاحب! دیکھو، پھر تم دنگا کرتے ہو۔ وہی بیش و بیشتر، کا قصہ نکلا۔ غلطی میں جمہور کی پیروی کیا فرض ہے؟ یاد رکھو یا ے تحتانی تین طرح پر ہے۔

جزو کلمہ:

مصرع: ہمارے بر سر مرغان ازاں شرف دارد

مصرع: اے سر نامہ تو عقل گرہ کشائے را

یہ ساری غزل اور مثل اس کے جہاں یائے تختانی ہے۔ جزو کلمہ ہے۔ اس پر ہمزہ لکھنا گویا عقل کو گالی دینا ہے، دوسری تحتانی مضاف ہے۔ صرف اضافت کا کرہ ہے۔ ہمزہ وہاں بھی مخل ہے۔ جیسے آسیائے چرخ یا آشنائے قدیم توصیفی، اضافی بیانی کسی طرح کا کسرہ، ہمزہ نہیں چاہتا۔ فدائے تو شوم، رہنمائے تو شوم" یہ بھی اسی قبیل سے ہے۔

تیسری دو طرح پر ہے: یائے مصدری اور وہ معروف ہوگی۔ دوسری طرح، توحید تنکیر، وہ مجہول ہوگی، مثلاً مصدری آشنائی۔ یہاں ہمزہ ضرور، بلکہ ہمزہ نہ لکھنا عقل کا قصور، توحیدی، آشنائے، یعنی ایک آشنا یا کوئی آشنا۔ یہاں جب تک ہمزہ نہ لکھو گے۔ دانا نہ کہلاؤ گے۔

"نیم گنا" و "نیم نگاہ" و "نیم ناز" یہ روز مرہ اہل زبان ہے۔ نیم بمعنی اندک، ورنہ گناہ کا آدھا اور نگاہ کا ادھوڑا اور ناز آدھا مہلت میں ہے۔ ان چیزوں کا مناصفہ کیا؟ نیم گناہ پسند نہیں تازہ گناہ رہنے دو۔

''خستہ'' ''بستہ، تازہ'' ''غارہ'' ''خانہ'' ''دانہ'' ''آوارہ'' ''بے چارہ'' ''روزہ، بوزہ ہزار لفظ ہیں کہ ان کے آگے جب یائے توحید آتی ہے تو اس کی علامت کے واسطے ہمزہ لکھ دیتے ہیں۔ زرہ، گرہ، کلاہ، شاہ آ گاہ، آ گہہ صبحگاہ، صبحگہ ایسے الفاظ کے اگے تحتانی آتی ہے تو زرہ ہے۔ گرہ ہے کلا ہے۔ شا ہے۔ آ گا ہے آ گہے گاہ ے۔ گہے لکھ دیتے ہیں۔

غالب

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

دیدمست یہ لفظ نیا بنایا ہے۔ مقصود تمہارا تو میں نے سمجھ لیا۔ مگر زنہار اور کوئی نہ سمجھے گا۔ المعنی فی بطن القائل، کے یہی معنی ہے چشمان پرخمار و چشمان بے حیا ران دونوں ترکیبوں میں سے ایک لکھ لو، ان سب اشعار میں نہ عیب نہ لطف۔

دیکھو صاحب، خط میں تم پھر وہی بیش و بیشتر کا قصہ لائے ہو، چہ جرم و چہ سبب چہ گناہ پر جو سند لاتے ہو۔

عشق است و صد ہزار تمنا مرا چہ جرم

اس کی حاجت کیا ہے؟ ''جانا مدد دے'' ''یاراں مدد دے'' یہ تمام غزل اسی طرح کی ہے۔ اگر یہ ترکیب درست نہ ہوتی۔ تو میں ساری غزل کیوں نہ کاٹ ڈالتا؟ دیکھو رفیع السواد کہتا ہے۔

نہ ضرر کفر کو م نے دین کو نقصان مجھ سے
باعث دشمنی اے گبرہ مسلماں مجھ سے !

غالب کہتا ہے:

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دور جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شر اب میں

یعنی اب جو دور مجھ تک آیا ہے۔ تو میں ڈرتا ہوں یہ جملہ سارا مقدر ہے۔ میرا فارسی کا دیوان جو دیکھے گا وہ جانے گا کہ جملے کے جملے مقدر چھوڑ جاتا ہوں مگر:

ہر سخن وقتے و ہر نقطہ مکانے دارد

یہ فرق البتہ وجدانی ہے۔ بیانی نہیں ہے[2]

اگر دریافتی برداشت بوس
وگر غافل شدی ، افسوس ، افسو

روز جمعہ ۱۳، جنوری ۱۸۵۴ء از اسد اللہ

---

[1] یعنی جب دین و کفر کو مجھ سے کوئی نقصان پہنچے کا امکان نہیں تو پھر اے مسلمانوں اور غیر مسلمو، میرے ساتھ تم لوگوں کی دشمنی کا کیا سبب ہے۔ [2] یعنی اس فرق کو بیان کے ذریعے سے سمجھانا یا بیان میں لانا مشکل ہے۔ یہ انسان کے ذوق وجدان پر موقوف ہے۔

All rights reserved. ©2002-2006

(۲۴)

بندہ پرور،

ایک مہربانی نامہ سکندر آباد سے اور ایک علی گڑھی سے پہنچا۔ یقین ہے کہ بابو صاحب تمہارے خط کے جواب میں کچھ حال لکھیں گے اور تم موافق اپنے وعدے کے مجھ کو لکھو گے۔ اب جب اس خط کا جواب تمہارے یدس پاس سے آئے گا، تب تمہارے اشعار تم کو پہنچیں گے۔ ہائے ہائے! میر تفضّل حسین خان ہائے ہائے۔

رفیق و مرا خبر نہ کردی

بر بیکیم نظر نہ کردی

یہاں سنا گیا ہے کہ میر احمد حسین بڑا بیٹا ان کا، ان کے کام پر مقرر ہوا اور میرا شاد حسین بدستور نائب رہے۔

۲۳ فروری ۱۸۵۴ء

اسداللہ

(۲۵)

منشی صاحب!

تمہارا خط اس دن یعنی، کل بدھ کے دن پہنچا میں چار دن سے لرزے میں مبتلا ہوں اور مزہ یہ ہے کہ جس دن سے لرزہ چڑھا ہے، کھانا مطلق نہیں کھایا۔ آج پنجشنبہ پانچواں دن ہے کہ نہ کھانا دن کو میسر ہے اور نہ رات کو شراب۔ حرامت مزاج میں بہت ہے۔ ناچار احتراز کرتا ہوں۔ بھائی اس لطف کو دیکھو کہ پانچواں دن ہے کھانا کھائے۔ ہرگز بھوک نہیں لگی اور طبیعت غذا کی طرف متوجہ نہیں ہوئی۔ بابو صاحب والا مرزا کا خط تمہارے نام کا دیکھا۔ اب اس ارسال میں وہ آسانی نہ رہی اور بندہ دشواری سے بھاگتا ہے۔ کیوں تکلیف کریں؟ اور اگر بہر حال ان کی مرضی ہے تو خیر میں فرمان پذیر ہوں۔ اشعار سابق و حال میرے پاس امانت ہیں بعد اچھے ہونے کے ان کے دیکھوں گا اور تم کو بھیج دوں گا۔ اتنی سطریں مجھ سے بہ ہزار جر ثقیل لکھی گئی ہیں۔

روز پنجشنبہ ۲۔ مارچ ۱۸۵۴

اسد اللہ

(۲۶)

میرا اسلام پہنچے۔ خط اور کاغذ اشعار پہنچا۔ سابق اور حال ابھی سب یوں ہی دھرے رہیں گے۔ اگر چہ گرمہ رفع ہوگئی ہے۔ مینہ برسنے لگا، ہوا سرد چلنے لگی۔ مگر دل مکدر ہے اور حواس ٹھکانے نہیں۔ بادشاہ کا قصیدہ سارا اور ولیعہد کا قصیدہ بے خاتمہ آگے سے کہہ رکھا تھا۔ اس کا خاتمہ بہ ہزار مشقت رمضان میں کرلیا اور عید کو دونوں پڑھ دیے۔ منشی نبی بخش کو پرسوں یا ترسوں بھیجوں گا۔ ان سے لے کر تم بھی دیکھنا۔ میں نے ان کو لکھ بھیجا ہے۔ کہ منشی ہرگوپال صاحب کو بھی دینا کہ وہ پڑھ لیں اور چاہیں تو نقل بھی لے لیں۔ اس کے سوا جو کچھ تمہارے خط میں لکھا تھا۔ وہ جواب طلب نہیں اور یونہی ہے جو تم سمجھتے ہو۔

لفظ معنی بھاری چیز کا کھینچنا۔ مراد سخت مشقت و تکلیف سے

(جون ۱۸۵۴ء) اسداللہ

صاحب!

دیباچہ وتقریظ کا لکھنا ایسا آسان نہیں ہے کہ جیسا تم کو دیوان کا لکھ لینا۔ کیوں روپیہ خراب کرتے ہو۔ اور کیوں چھپواتے ہو؟ اگر یوں ہی جی چاہتا ہے تو ابھی کہے جاؤ۔ آگے چل کر دیکھ لینا۔ اب یہ دیوان چھپوا کر اور تیسرے دیوان کی فکر میں پڑو گے۔ تم دو چار برس میں ایک دیوان کہہ لوگے۔ میں کہاں تک دیباچے لکھا کروں گا۔ مدعا یہ ہے کہ اس دیوان کو اس دیوان کے برابر ہو لینے دو۔ اب کچھ قصیدہ و رباعی کی فکر کیا کرو۔ دو چار برس میں اس قسم سے جو کچھ فراہم ہو جائے۔ دوسرے دیوان میں اس کو بھی درج کرو۔

صاحب، جہاں تقطیع میں الف نہ سمائے وہاں کیوں لکھو؟

۱۸۵۵ء اسد

صاحب!

تم جانتے ہو کہ یہ معاملہ کیا ہے اور کیا واقع ہوا؟ وہ ایک جنم تھا کہ جس میں ہم تم باہم دوست تھے اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملات مہر و محبت درپیش آئے ،شعر کہے۔ دیوان جمع کیے۔ اسی زمانے میں ایک بزرگ تھے کہ وہ ہمارے تمہارے دوست دلی تھے۔ اور منشی نبی بخش ان کا نام اور حقیر تخلص تھا۔ ناگاہ نہ وہ زمانہ نہ وہ اشخاص نہ وہ معاملات ،نہ وہ اختلاط، نہ وہ انبساط، بعد چندمدت کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا۔ اگر چہ صورت اس جنم کو بعینہ مثل پہلے جنم کے ہے۔ یعنی ایک خط میں نے منشی نبی بخش صاحب کو بھیجا۔ اس کا جواب مجھ کو آیا اور ایک خط صورت اس جنم کی بعینہ مثل پہلے جنم کے ہے۔ یعنی ایک خط میں نے منشی نبی بخش صاحب کو بھیجا۔ اس کا جواب مجھ کو آیا اور ایک خط تمہارا کہ تم بھی موسوم بہ منشی ہرگوپال اور متخلص بہ تفتہ ہو۔ آج آیا اور میں جس شہر میں ہوں اس کا نام بھی دلی اور اس محلے کا نام بلی ماروں کو محلّہ ہے۔ لیکن ایک دوست اس جنم کے دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا۔ واللہ ڈھونڈ ھنے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا۔ کیا امیر، کیا غریب کیا اہل حرفہ۔ اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں۔ ہنود البتہ کچھ کچھ آباد ہو گئے ہیں۔

اب پوچھو تو کیوں کر مسکن قدیم میں بیٹھا رہا۔ صاحب بندہ میں حکیم محمد حسن خاں مرحوم کے مکان میں نو دس برس سے کرایہ کو رہتا ہوں۔ اور یہاں قریب کیا دیوار بہ دیوار ہیں گھر حکیموں کے اور وہ نوکر ہیں راجہ نرندر سنگھ بہادر والی پٹیالہ

کے۔ راجا صاحب نے صاحبان عالی شان[1] سے عہد لیا تھا کہ بروقت غارت دہلی یہ لوگ بچے رہیں۔ چنانچہ بعد فتح راجا کے سپاہی یہاں آ بیٹھے اور یہ کوچہ محفوظ رہا۔ ورنہ میں کہاں اور یہ شہر کہاں؟ مبالغہ نہ جاننا امیر غریب سب نکل گئے، جو رہ گئے تھے نکالے گئے ۔ جاگیردار پنسن دار، دولت مند۔ اہل حرفہ کوئی بھی نہیں ہے۔ مفصل حالات لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ ملازمان قلعہ پر شدت ہے۔ باز پرس اور دارو گیر میں مبتلا ہوں۔ مگر ہو نوکر جو اس ہنگامے میں نوکر ہوئے اور ہنگامے میں شریک رہے ہیں۔ میں غریب شاعر، دس برس سے تاریخ لکھنے اور شعر کی اصلاح دینے پر متعلق ہوا ہوں۔ خواہ اس کو نوکری سمجھو۔ خواہی مزدوری جانو، اس فتنہ و آشوب میں کسی مصلحت میں میں نے دخل نہیں دیا۔ صرف اشعار کی خدمت بجالاتا رہا[2] اور نظر اپنی بے گناہی پر شہر سے نکل نہیں گیا۔ میرا شہر میں ہونا حکام کو معلوم ہے۔ مگر چونکہ میری طرف بادشاہی دفتر میں سے یا مخبروں کے بیان سے کوئی بات نہیں پائی گئی۔ لہذا طلبی نہیں ہوئی۔ ورنہ جہاں بڑے بڑے جاگیردار بلائے ہوئے یا پکڑے ہوئے آئے ہیں۔ میری کیا حقیقت تھی۔ غرض کہ اپنے مکان میں بیٹھا ہوں۔ دروازہ سے باہر نہیں نکل سکتا۔ سوار ہونا اور کہیں جانا تو بہت بڑی بات ہے۔ رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے، شہر میں ہے کون جو آوے۔ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔ مجرم سیاست پاتے جاتے ہیں۔ جرنیلی بندوبست[3] یازدہم مئی ۵۷ء سے آج تک یعنی شنبہ پنجم دسمبر ۱۸۵۷ء تک بدستور ہے۔ کچھ نیک و بد کا حال مجھ کو معلوم نہیں۔ بلکہ ہنوز ایسے امور کی طرف حکام کو توجہ بھی نہیں۔ دیکھیے۔ انجام کار کیا ہوتا ہے۔ یہاں سے باہر اندر نہیں۔ بہر حال منشی صاحب کو میرا سلام

کہنا اور یہ خط دکھا دینا۔ اس وقت تمہارا خط پہنچا اور اسی وقت میں نے یہ خط لکھ کر ڈاک کے ہرکارے کو دے دیا۔

شنبہ ۵۔ دسمبر ۱۸۵۷ء

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

آج سنیچر بار (ہفتہ) کو دوپہر کے وقت ڈاک کا ہرکارہ آیا اور تمہارا خط لایا۔ میں نے پڑھا اور جواب لکھا اور کلیان کو دیا۔ وہ ڈاک کو لے گیا۔ خدا چاہے تو کل پہنچ جائے۔ میں تم کو لکھ چکا ہوں کہ دلی کا قصد کیوں کرو اور یہاں آ کر کیا کرو گے۔ بنک گھر میں سے خدا کرے تمہارا روپیہ مل جائے۔

بھائی، میرا حال یہ ہے کہ دفتر شاہی میں میرا نام مندرج نہیں نکلا۔ کسی مخبر نے بہ نسبت میرے کوئی خبر بد خواہی کی نہیں دی۔ حکام وقت میرا شہر میں ہونا جانتے ہیں۔ فراری نہیں ہوں۔ روپوش نہیں ہوں۔ بلایا نہیں گیا۔ دارو گیر سے محفوظ ہوں۔ کسی طرح کی باز پرس ہو تو بلایا جاؤں مگر ہاں جیسا کہ بلایا نہیں گیا۔ خود بھی بروے کار نہیں لایا۔ کسی حاکم کو نہیں ملا۔ خط کسی کو نہیں لکھا۔ کسی سے درخواست ملاقات نہیں کی۔ مئی سے پنسن نہیں پایا۔ کہو یہ دس مہینے کیوں کر گزرے ہوں گے۔ انجام کچھ نظر نہیں آتا کہ کیا ہوگا۔ زندہ ہوں مگر زندگی وبال ہے۔ ہرگو بند سنگھ یہاں اۓ ہوۓ ہیں۔ ایک بار میرے پاس بھی آئے تھے۔ والدعا

روز شنبہ ۳۱ جنوری ۱۸۵۸ء وقت نیمروز

غالب

---

۱ انگریزوں کے خلاف ہنگامہ بپا رہنے کے دوران میں ۲ کیا اس سے یہ سمجھا جائے کہ بادشاہ کی غزلیں درست کرتے رہے؟ ۳ مارشل لاء کا نہایت عمدہ ترجمہ ہے ۴ تاریخ ابتداء ہنگامہ ۱۸۵۷ء

(۳۰)

آ زعمر و دولت برخوردار باشند

بدھ اک دن، تیسری تاریخ فروری کی، ڈیڑھ پہر دن باقی رہے ڈاک کا ہرکارہ آیا اور خط مع رجسٹری دیا۔ خط کھولا۔ سو روپے کی ہنڈوی۔ بل جو کچھ کہیے وہ ملا۔ ایک آدمی رسید مہری لے کر ن نیل کے کٹرے میں چلا گیا۔ سو روپے چہرہ شاہی لے آیا۔ آنے جانے کی دیر ہوئی اور بس۔ چوبیس روپے داروغہ کی معرفت اٹھے تھے۔ وہ دیے گئے پچاس روپے محل میں بھیج دیے۔ چھبیس روپے باقی رہے۔ وہ بکس میں رکھ لیے۔ روپے کے رکھنے کے واسطے بکس کھولا تھا، سو یہ رقعہ بھی لکھ لیا۔ کلیان سودا لینے بازار گیا ہوا ہے۔ اگر جلد آ گیا تو آج، ورنہ کل یہ خط ڈاک میں بھیج دوں گا۔ خدا تم کو جیتا رکھے اور اجر دے۔ بھائی بڑی آہنی ہے۔ انجام اچھا نظر نہیں آتا۔ قصہ مختصر یہ کہ قصہ تمام ہوا۔

چہار شنبہ ۳ فروری ۱۸۵۸ء وقت دوپہر

غالب

(۳۲)

جان من و جانان من!

کل میں نے تم کو سکندر آباد میں سمجھ کو خط بھیجا۔ شام کو تمھارا خط آیا۔ معلوم ہوا کہ تم اکبر آباد پہنچے خیر وہ خط پوسٹ پیڈ گیا۔ شاید الٹا نہ پھرے۔ اگر پھر آئے گا تو خیر، آج یہ خط تم کو اکبر آباد بھیجتا ہوں۔ پہنچنے پر جواب لکھنا۔

تقطیع رباعی کی بہت خوب، مگر خیر ہر ایک بات کا وقت ہے۔ ہم کو ہر طرح سے لطف صحبت و لطف شعر اٹھا لینا۔ بھائی منشی نبی بخش صاحب کے نام پڑھ کر ان کو دے دینا اور اس کا مضمون معلوم کر لینا۔ جس حاکم کو میں نے یہ خط اور رقعہ بھیجا ہے۔ اس کے سر رشتہ دار کوئی صاحب ہیں۔ من پھول ان کا نام ہے۔ مجھ سے نا آشنا ہے محض ہیں۔ اگر تعارف ہوتا تو استدعا کرتا کہ اس تحریر کو پیش کیجئے۔ کاش تم سے آشنائی ہوتی تو تمھیں او پر اوپر ایک خط لکھ کر ان کو بھیج دیتے کہ غالب ایک فقیر گوشہ نشین اور بے گناہ محض اور واجب الرحم ہے۔ اس کے حصول مطالب میں دریغ نہ کرنا چاہیے۔

مے تواں آورد استغنا سفارش نامہ

چرخ کج رو را اگر دانیم کز یاران کیست

باقی جو حال ہے وہ بھائی کے نام کے ورق میں لکھ چکا ہوں۔ تم پڑھ لو گے۔ دوبارہ لکھنا کیا ضرور؟

شنبہ ۶، مارچ ۱۸۵۸ء جواب طلب

صاحب،

تمہاری سعادت مندی کو ہزار ہزار آفرین، تم کو یوں ہی چاہیے تھا۔ لیکن میں نے تو ایک بات بطریق تمنا لکھی تھی۔ جیسا کہ عربی میں لیت اور فارسی میں کاشکے۔

اب تم روداد سنو۔ عرضی میری سر جان لارنس چیف کمشنر بہادر کو گزاری۔ اس پر دستخط ہوئے کہ یہ عرضی مع کاغذ ضمیمہ سائل کے پاس بھیج دی جائے اور یہ لکھا جائے کہ معرفت صاحب کمشنر دہلی کے پیش کرو۔ اب سر رشتہ دار کو لازم تھا کہ میرے نام موافق دستور کے خط لکھتا۔ یہ نہ ہوا۔ وہ عرضی حکم چڑھی ہوئی میرے پاس آ گئی۔ میں نے خط کمشنر دہلی چارلس سانڈرس کو لکھا اور وہ عرضی حکم چڑھی ہوئی اس میں ملفوف کر کے بھیج دی۔ صاحب کمشنر نے کلکٹر کے پاس یہ حکم چڑھا کر بھیجی کہ سائل کے پنسن کی کیفیت لکھو۔ اب وہ مقدمہ کلکٹر صاحب کے ہاں آیا ہے۔ ابھی صاحب کلکٹر نے تعمیل اس حکم کی نہیں کی۔ پرسوں تو ان کے ہاں یہ روبکاری آئی ہے۔ دیکھیے کچھ مجھ سے پوچھتے ہیں یا اپنے دفتر سے لکھ کر بھیجتے ہیں۔ دفتر کہاں رہا ہے۔ جو اس کو دیکھیں گے۔

بہر حال یہ خدا کا شکر ہے کہ بادشاہی دفتر میں سے مراد کچھ شمول فساد میں پایا نہیں گیا اور میں حکام کے نزدیک یہاں تک پاک ہوں۔ کہ پنسن کی کیفیت طلب ہوئی ہے۔ اور میری کیفیت کا ذکر نہیں ہے۔ یعنی سب جانتے ہیں کہ اس کو لگاؤ نہ تھا

کے

مولوی قمر الدین خاں کا کول نہ جانا اور رراہ وے پھر آنا معلوم ہوا۔ حق تعالیٰ ان کو زندہ اور سلامت رکھے۔ میرا سلام کہنا اور یہ خط پڑھا دینا۔ بھائی منشی نبی بخش صاحب کو میرا سلام اور ان کے بچوں کو دعا کہنا اور یہ خط ضرور پڑھا دینا اور کہنا کہ بھائی ہدایت سے تو اچھی ہے۔ نہایت ہے بھی خدا اچھی کرے۔ وہ عزت اور وہ ربط و ضبط جو ہم رئیس زادوں کا تھا۔ اب کہاں؟

روٹی کا ٹکڑا ہی مل جائے تو غنیمت ہے گورنری کلکتہ اور گورنری آگرہ اور راجنٹی و کمشنری و دیوانی و فوجداری و کلکٹری دہلی سے جو حکم میرے خط اور عرضی پر ہوا ہے۔ مشتمل اس حکم پر خط میرے نام آیا ہے۔ حاکم نے اب بھی یہی حکم دیا تھا کہ لکھا جائے کہ یوں کرو۔ عملہ نے خط نہ لکھا۔ صرف وہ عرضی حکم چڑھی ہوئی بھیج دی۔ خیر،

ہر چہ از دوست مے رست نیکوست

سنو، میرزا تفتہ میں جو اپنا حال تم کو لکھا کروں۔ وہ تم میرے بھائی کو اور مولوی قمر الدین خاں کو دکھا دیا کرو۔ تین تین جگہ ایک بات کو کیوں لکھوں۔

جمعہ۔ ۱۲ مارچ ۱۸۵۸

---

۱ من پھول غالباً وہی پنڈت من پھول ہے جو دہلی کالج کا تعلیم یافتہ ہے۔ اور پنجاب میں لفٹنٹ گورنر کا میر منشی ہو گیا تھا۔ اس کے زیر سر کردگی ایک وفد، سیاسی حالات معلوم کرنے کے لیے جولائی ۱۸۶۵ء میں ترکستان بھیجا گیا۔ جو کم و بیش آٹھ مہینے وہاں رہا۔ اس میں شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد مرحوم بھی شامل تھے۔ آزاد اور ایک منشی فیض بخش پشاوری ترکستان بھی گئے لیکن پنڈت من پھول فیض آباد سے آگے نہ بھیجا۔ ۲ میاں سرجان لارنس ہونا چاہیے جو سر ہنری لارنس کا

چھوٹا بھائی تھا۔ اس لیے کہ اول پنجاب کا چیف کمشنر وہی مقرر رہوا تھا۔ دوم سر ہنری لارنس اس خط کی تحریر سے کم و بیش آٹھ مہینے پیشتر لکھنو میں مارا گیا تھا۔ سر ہنری پنجاب میں انتظامی بورڈ کا صدر تھا اور ۱۸۵۳ء میں بورڈ ختم ہو گیا تھا۔ ۲؎ یعنی اہل ہنگامہ سے۔ ۳؎ آغاز، ابتداء ۴؎ انجام

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
اقبال اردو سائبر لائبریری
©2002-2006

(۳۴)

صاحب!

کیوں مجھے یاد کیا؟ کیوں خط لکھنے کی تکلیف اٹھائی، پھر یہ کہتا ہوں کہ خدا تم کو جیتا رکھے کہ تمہارے خط میں مولوی قمر الدین کا سلام بھی آیا اور بھائی منشی نبی بخش کی خیر و عافیت بھی معلوم ہوئی۔ وہ تو پنسن کے فکر میں تھے۔ ظاہر یوں مناسب دیکھا ہوگا کہ نوکری کی خواہش کی۔ حق تعالیٰ ان کی جو مراد بر لائے۔ ان کو میرا سلام کہہ دینا۔ بلکہ یہ رقعہ پڑھوا دینا۔ مولوی قمر الدین خاں کو بھی میرا سلام کہنا۔

تم اپنے کلام کے بھیجنے میں مجھ سے پرستش کیوں کرتے ہون۔ چار جزو ہیں تو، بیس جزو ہیں تو بے تکلف بھیج دو۔ میں شاعر سخن سنج اب نہیں رہا۔ صرف سخن فہم رہ گیا ہوں۔ بوڑھے پہلوان کی طرح پیچ بتانے کی گوں کا ہوں۔ بناوٹ نہ سمجھنا۔ شعر کہنا مجھ سے بالکل چھوٹ گیا ہے۔ اپنا اگلا کلام دیکھ کر حیران رہ جاتا ہوں کہ میں نے کیونکر کہا تھا۔ قصہ مختصر دو اجزا جلد بھیج دو۔

یک شنبہ ۱۲۔ اپریل ۱۸۵۸ء

غالب

(۳۵)

میرزا تفتہ!

عجب اتفاق ہوا۔ پنجشنبہ کے دن ۲۲، اپریل کو کلیان خط ڈاک میں ڈال کر آیا۔ اس کے متعاقب پارسل کا ہرکارہ آیا اور تمہارا بھیجا ہوا پاکٹ لایا۔ رسید لکھنی میں نے زائد سمجھی اور اس کا دیکھنا شروع کیا۔ بے کار محض اور تنہا ہوں۔ پانچ پہر کا دن۔ میری بڑی دل لگی ہوگئی۔ خوب دیکھا۔ سچ تو یوں ہے کہ ان اشعار سے میں نے بہت حظ اٹھایا۔ جیتے رہو۔ تمہارا دم غنیمت ہے۔

بھائی[1] کا حال مفصل لکھو۔ پنسن کے طالب ہیں یا نوکری کے، منشی عبداللطیف[2] کہاں ہے؟ اور کس طرح ہے علاقہ بنا ہوا ہے یا جاتا رہا، صاحب لفٹنٹ گورنری کا محکمہ بالکل الہ آباد کو گیا یا ہنوز یہاں بھی ہے؟ منشی غلام غوث صاحب کہاں ہیں؟ نوکر ہیں یا مستعفی؟ عدالت دیوانی کا محکمہ یہیں رہے گا یا الہ آباد جائے گا؟ اور اس کا اور گورنری کے محکمے کا ساتھ ہے، چاہیے یہ بھی وہیں جائیں۔ آج تمہارے اشعار کا کاغذ پمفلٹ پاکٹ اسی خط کے ساتھ ڈاک میں بھیجا گیا ہے۔ یقین ہے کہ یہ خط کل پرسوں اور وہ پاکٹ پانچ دن میں پہنچ جائے۔

یک شنبہ ۲۵ اپریل ۱۸۵۸ء

غالب

---

[1] منشی نبی بخش حقیر [2] حقیر کا فرزند

(۳۲)

صاحب!

۲۵، اپریل کو ایک خط اور ایک پارسل ڈاک میں ارسال کر چکا ہوں۔ آج ۳۰ ہے۔ یقین ہے خط اور پارسل دونوں پہنچ گئے ہوں گے۔ ایک امر ضروری باعث اس تحریر کا ہے کہ جو میں اس وقت روانہ کرتا ہوں۔ ایک میرا دوست اور تمہارا ہمدرد ہے۔ اس نے اپنے حقیقی بھتیجے کو بیٹا کر لیا تھا۔ ۱۸، ۱۹ برس کی عمر، قوم کا کھتری، خوب صورت وضعدار نوجوان، ۱۲۷۳ء میں بیمار پڑ گیا مر گیا۔ اب اس کا باپ مجھ سے آرزو کرتا ہے کہ ایک تاریخ اس کے مرنے کی لکھوں۔ ایسی کہ وہ فقط تاریخ نہ ہو بلکہ مرثیہ ہو کہ وہ اس کو پڑھ پڑھ کر رویا کرے۔ سو بھائی۔ اس سائل کی خاطر مجھ کو عزیز اور فکر شعر متروک، معہذا یہ واقعہ تمہارے حسب حال ہے۔ جو خونچکاں شعر تم نکالو گے۔ وہ مجھ سے کہاں نکلیں گے۔ بطریق مثنوی بیس تیس شعر لکھ دو۔ مصرع آخر میں مادہ تاریخ ڈال دو۔ نام اس کا برج موہن تھا اور اس کو بابو بابو کہتے تھے۔ چنانچہ میں بحر ہزج مسدس مخبوں میں ایک شعر تم کو لکھتا ہوں۔ چاہو اس کو آغاز میں رہنے دو اور آئندہ اسی بحر میں اور اشعار لکھ دو۔ چاہو کوئی اور طرح نکال لو۔ لیکن یہ خیال رہے کہ سائل کو متوفی کے نام کا درج ہونا منظور ہے اور بابو برج موہن سوائے اس بحر کے یا بحر رمل کے اور بحر میں نہیں آ سکتا۔ وہ میرا شعر یہ ہے۔

برم چوں نام بوبو برج موہن
چکد خون دل ریش از لب من

نگاشتہ روز جمعہ سی۔ ام اپریل ۱۸۵۸ء

غالب

بھائی!

وہ پہلا خط تم کو بھیج چکا تھا کہ بیمار ہو گیا۔ بیمار کیا ہوا توقع زیست کی نہ رہی۔ قولنج اور پھر کیسا شدید کہ پانچ پہر مرغ نیم بسمل کی طرح تڑپا کیا۔ آخر عصارہ ریوند[1] اور ارنڈی کا تیل[2] پیا۔ اس وقت تو بچ گیا مگر قصہ قطع نہ ہوا۔ مختصر کہتا ہوں۔ میری غذا تم جانتے ہو کہ تندرستی میں کیا ہے۔ دس دن میں دو بارہ آدھی آدھی غذا کھائی۔ گویا دس دن میں ایک بار غذا تناول فرمائی۔ گلاب اور املی کا پنا[3] اور آلو بخارے کا افشردہ۔ اس پر مدار رہا۔ کل سے خوف مرگ گیا ہے۔ صورت زیست کی نظر آئی ہے آج صبح کو بعد دوا پینے کے تم کو یہ خط لکھا ہے۔ یقین تو ہے کہ آج پیٹ بھر کر روٹی کھا سکوں۔

صاحب، وہ جو میں نے بائیس شعر مرثیہ کے لکھ کر تم کو بھیجے۔ اس سے مقصود تھا کہ تم اپنے اشعار دوسرے ماتم زدہ کو دے دو۔ کس واسطے کہ تمہاری تحریر سے معلوم ہوا تھا کہ کوئی اور بھی فلک زدہ ہے اور یہ جو تم لکھتے ہو کہ کچھ اور پہ تہی شعر میں سے ایک شعر بھی تو نے نہ لیا۔ اس کا حال یہ ہے کہ وہ شعر سب دست و گریبان تھے۔ ایک کو ایک سے ربط۔ ایک یا دو شعر اس میں سے کیوں کر لیے جاتے۔ اشعار سب میرے پسند، بے سقم، بے عیب وہ جو تم لکھتے ہو کہ:

حرف بابو ہر ج موہن مے زنم

اور اس کا دوسرا مصرع بھول گیا ہوں مگر قافیہ ہیں "من" ہے یہ شعر غالب کو برا

معلوم ہوا ہو گا۔ واللہ باللہ جب تک تم نے نہیں دیکھا۔ میرے خیال میں بھی یہ بات نہ تھی۔ بہر حال بات وہی ہے جو میں اوپر لکھ آیا ہوں۔

بارے، اب بھی بھائی منشی نبی بخش صاحب اور مولوی قمر الدین خاں صاحب روزوں کے متوالے ہوش میں آئے انہیں آئے، آج از شوال ۱۲۷۴ء کی ہے۔ ششم عید کا بھی زمانہ گزر گیا۔ خدا کے واسطے ان کی خیر و عافیت لکھو اور یہ عبارت بھائی صاحب کو نظر انور سے گزرانو، شاید وہ مجھ کو خط لکھیں۔

محررہ و مرسلہ دوشنبہ ۲۴ مئی ۱۸۵۸ء

غالب

---

۱ یہاں ''ہمدرد'' کے معنی مونس اور غمخوار کے نہیں بلکہ یہ معنی ہیں کہ اسے بھی وہی درد ہے جو تمہیں ہے۔ تفتہ کے ایک بیٹے چھمبر سنگھ کا انتقال ہو گیا تھا۔ جس کی وفات پر تین سو بائیس شعر کا مرثیہ کہا تھا۔ جس شخص کا ذکر غالب نے کیا۔ اس کے بھی لے پالک بیٹے کا انتقال ہو گیا تھا۔ ۲ ریوند ایک اسہال آور دوا ہے پانی میں بھگو کر اور چھان کر پیتے ہیں۔ اسے عصارہ یا افشردہ کہتے ہیں۔ ۳ انگریزی کیسٹر آئل، ۴ شربت جو املی کو پانی میں ملا کر بناتے ہیں۔

(۳۸)

کیوں صاحب!

مجھ سے کیوں خفا ہو؟ آج مہینا بھر ہو گیا ہو گا یا بعد دو چار دن کے ہو جائے گا کہ آپ کا خط نہیں آیا۔ انصاف کرو، کتنا کثیر الاحباب آدمی تھا۔ کوئی وقت ایسا نہ تھا کہ میرے پاس دو چار دوست نہ ہوتے ہوں۔ اب یاروں میں ایک شیو جی رام برہمن اور بال مکند اس کا بیٹا۔ یہ دو شخص ہیں کہ گاہ گاہ آتے ہیں۔ اس سے گزر کر لکھنو اور کالپی اور فرخ آباد اور کس کس ضلعے سے خطوط آتے رہتے ہیں۔ ان دوستوں کا حال ہی نہیں معلوم کہ کہاں ہیں اور کس طرح ہیں۔ وہ آمد خطوط کی موقوف، صرف تم تین صاحبوں کے آنے کی توقع۔ اس میں دونوں صاحب گاہ گاہ ہاں ایک تم ہو کہ ہر مہینے میں ایک دو بار مہربانی کرتے ہو۔

سنو صاحب، اپنے اوپر لازم کر لو ہر مہینے میں ایک خط مجھ کو لکھنا۔ اگر کام پڑا۔ دو خط تین خط ورنہ صرف خیر و عافیت لکھی اور ہر مہینے میں ایک بار بھیج دی۔ بھائی صاحب کا خط بھی دس بارہ دن ہوئے کہ آیا تھا۔ اس کو جواب بھیج دیا گیا۔ مولوی قمر الدین خاں یقین ہے کہ الہ آباد گئے ہوں گے۔ کس واسطے کہ مجھ کو مئی میں لکھا تھا کہ اوائل جون میں جاؤں گا۔ بہر حال اگر آپ آزردہ نہیں تو جس دن میرا خط پہنچے ۔ اس کے دوسرے دن اس کا جواب لکھیے۔ اپنی خیر و عافیت، منشی صاحب کی خیر و عافیت، مولوی صاحب کا احوال، اس سے سوا گوالیار کے فتنہ و فساد کا ماجرا جو معلوم ہوا ہو۔ وہ الفاظ مناسب وقت میں ضرور لکھنا۔ راجہ جو وہاں آیا ہوا

ہے۔ اس کی حقیقت، دھول پور کا رنگ، صاحبان عالی شان کا ارادہ وہاں کے بندوبست کا کس طرح پر ہے؟ آگرے کا حال کیا ہے؟ وہاں کے رہنے والے کچھ خائف ہیں یا نہیں؟

نگاشتہ شنبہ ۱۹ جون ۱۸۵۸ء

غالب

۱۔ عید الفطر کے بعد چھ دن میں روزہ رکھنا سنت ہے۔ ۲۔ ان سے مراد نبی بخش حقیر، مولوی قمر الدین خاں اور تفتہ ہیں۔

جیتے رہو اور خوش رہو:

اے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کر دی

زیادہ خوشی یہ کہ تم نے تحریر کو تقریر کا پرواز دے دیا تھا۔ گرمی ہنگامہ انطباع، دیوان وغیرہ میں پہلے جانتا ہوں۔ بنک گھر کارو پیہ مصرف کاغذ و کاپی ہے۔ خدا تم کو سلامت رکھے۔ مغتنمات سے ہو۔ رجب علی بیگ سرور نے جو فسانہ عجایب لکھا ہے۔ آغاز داستان کا شعر مجھ کو بہت مزہ دیتا ہے۔

یاد گارِ زمانہ میں ہم لوگ
یاد رکھنا، فسانہ ہیں ہم لوگ

مصرع ثانی کتنا گرم ہے اور یاد رکھنا فسانہ کے واسطے کتنا مناسب:

منشی عبداللطیف کے گھر میں لڑکے کے پیدا ہونے کی خبر مجھ کو ہو چکی ہے اور تہنیت کا بھائی کو خط لکھ چکا ہوں۔ اب جوان سے ملو تو میرا سلام کہہ کر اس خط کے پہنچنے کی اطلاع لے لینا۔ مولوی معنوی اِجب کانپور سے معاودت فرمائیں۔ مجھ کو اطلاع دینا۔ میرا حال بدستور:

ہماں پہلو، ہماں بستر ہما د درد

شنبہ ۲۶ جون، ۱۸۵۸ء روز ورود نامہ

غالب

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف

آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

پندرہ پرور، پہلے تم کو یہ لکھا جاتا ہے کہ میرے دوست قدیم میر مکرم حسین صاحب کی خدمت میں میرا اسلام کہنا یہ کہنا اب تک جیتا ہوں اور اس سے زیادہ میرا حال مجھے بھی معلوم نہیں۔ میرزا حاتم علی صاحب مہر کی جناب میں میرا اسلام کہنا اور میرا یہ شعر میری زبان سے پڑھ دینا:

شرط اسلام بود ورزش ایماں با الغیب

اے تو غائب ز نظر مہر تو ایمان من است

---

۱ مولوی قمر الدین کی طرف اشارہ ہے کہا جاتا ہے کہ اوپر کا شعر منتظر کا ہے۔ غالب نے اسے سرور کا نہیں لکھا صرف یہ لکھا ہے کہ آغاز دستان کا شعر۔۔۔

تمہارے پہلے خط کا جواب بھیج چکا تھا کہ اس کے دو دن یا تین دن کے بعد دوسرا خط پہنچا۔ سنو صاحب جس شخص کو جس شغل کا ذوق ہوا اور وہ اس میں بے تکلف عمر بسر کرے اس کا نام عیش ہے۔ تمہاری توجہ فقط بہ طرف شعر و سخن کے تمہاری شرافت نفس اور حسن طبع کی دلیل ہے اور بھائی یہ جو تمہاری سخن گستری ہے۔ اس کی شہرت میں میری بھی نام آواری ہے میرا حال اس فن میں اب یہ ہے کہ شعر کہنے کی روش اور اگلے کہے ہوئے اشعار سب بھول گیا مگر ہاں اپنے ہندی کلام میں سے ڈیڑھ شعر یعنی ایک مقطع اور ایک مصرع یاد رہ گیا ہے۔ سو گاہ گاہ جب دل

اللٹنے لگتا ہے تب دس پانچ بار یہ مقطع زبان پر آ جاتا ہے۔

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب

ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے!

پھر جب سخت گھبراتا ہوں اور تنگ آتا ہوں تو یہ مصرع پڑھ کر چپ ہو جاتا ہوں۔

اے مرگِ ناگہاں! تجھے کیا انتظار ہے؟

یہ کوئی نہ سمجھے کہ میں اپنی بے رونقی اور تباہی کے غم میں مرتا ہوں۔ جو دکھ مجھ کو ہے۔ اس کا بیان تو معلوم، مگر اس بیان کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ انگریز کی قوم میں سے جو ان روسیاہ کالوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔ ان میں کوئی میرا امید گاہ تھا اور کوئی شفیق اور کوئی دوست اور کوئی یار اور کوئی میرا شاگرد۔ ہندوستانیوں میں کچھ عزیز، کچھ دوست، کچھ شاگرد، کچھ معشوق۔ سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے۔ جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو اس کو زیست کیونکر دشوار ہو! ہائے اتنے یار مرے کہ جو اب میں مروں گا تو میرا کوئی رونے والا نہ ہو گا۔

انا اللہ وانا الیہ راجعون۔

-----اختتام-----حصہ اول-----